دشنام
کے
آئینے
مشکور حسین یاد

نسیم بکڈپو - شارع البیرونی - لاہور

اہتمام — سعید اے شیخ

نسیم بکڈپو، کچہری روڈ، لاہور

تعداد — گیارہ سو

طابع — آکسفورڈ اینڈ کیمبرج پریس لاہور

بار اوّل — جنوری ۱۹۷۵ء

قیمت

انتساب

اپنے ہی نام

وہ اِس لیے کہ مجھ مسمّی مشکورُ حُسین یادؔ سے بڑھ کر اُن گالیوں کا مستحق اور کون ہو سکتا ہے جو اِس کتاب میں طرح طرح کے آئینے دکھا رہی ہیں۔

آئینہ خانہ

دیباچہ

ہنسنے اور رونے کے درمیان ایک نہایت اہم منزل آتی ہے جس پر ٹھہرنا بہت ضروری ہے۔ عام طور پر اس منزل کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ غالباً اس لئے کہ یہ منزل ہنسنے اور رونے سے قبل کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ ہم یوں تو غور و فکر کی تعریف میں بڑے رطب اللسان ہوتے ہیں۔ لیکن جب وقت ہمیں کسی مسئلہ پر بذاتِ خود سوچنا پڑ جائے تو ہم اس سے بچنا چاہتے ہیں اس گریز کی وجہ صاف ہے۔ ہماری فکر ہمیں حقیقتِ امر کے عین سامنے لاکھڑا کرتی ہے۔ ادھر فطرتِ انسانی کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ وہ حقیقت سے آگاہ تو ضرور ہونا چاہتی ہے۔ لیکن اُس سے آنکھیں چار کرنا پسند نہیں کرتی۔ بہرحال ہنسنے کی بات ہو یا رونے کی یعنی خوشی ہو یا غم، دونوں صورتوں میں غور و فکر لازمی ہے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں اس کا بہت امکان ہے کہ بغیر سوچے سمجھے ہنسنے کے نتیجہ میں ہم اپنی تمام عمر رونے میں گزار دیں اور اسی طرح بغیر سوچے سمجھے رونے کے نتیجہ میں ہم اپنی بہت سی عمدہ صلاحیتوں کو خواہ مخواہ تباہ و برباد کر ڈالیں۔ ہنسنا ہو یا رونا انسانی زندگی کی یہ دونوں جوان جہان صورتیں اپنے بناؤ سنگھار کے لئے فکر کا ایک آئینہ چاہتی ہیں۔ فکر کا یہ آئینہ وہی چیز ہے جسے عرفِ عام میں طنز کہا جاتا ہے۔ اور طنز ہی وہ اہم منزل ہے جو ہر ہنسنے اور رونے کے درمیان واقع ہے اور جس پر ٹھہرنا ازبس ضروری ہے۔

طنز کے بارے میں ایک عام بات کہی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ طنز میں تلخی ہوتی ہے۔ طنز کے تلخ ہونے سے کون معقول آدمی انکار کر سکتا ہے لیکن نقاد حضرات اس تلخی کا اظہار کچھ

اس انداز سے کرتے ہیں جیسے یہ کوئی بہت ہی بُری چیز ہے اتنی بُری کہ طنز لکھنا کوئی خاص بات نہیں، اور پھر قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا طنز نگار کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس کی تخلیقات کو جھنجھلاہٹ کا ردِ عمل قرار دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے اہلِ تنقید کی یہ باتیں درست ہوں لیکن میں تو اس ضمن میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ طنز کی تلخی کو حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اس تلخی کو اس مشہور ضرب المثل کی روشنی میں مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے کہ سچ کڑوا ہوتا ہے۔ طنز کی تلخی صداقت اور سچائی کی تلخی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر خوشی اور غم کے ساتھ طنز کی کوئی نہ کوئی صورت نمودار ہوتی ہے۔ طنز ہمارے غم اور خوشی کی اُن صداقتوں اور سچائیوں کو ہم پر ظاہر کرتی ہے جنہیں ہم اُس وقت دیکھ نہیں رہے ہوتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرتاً ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُس کی ذات و حیات سے متعلق بچارہ صداقتوں کا اظہار نہایت خوشگوار فضا میں کیا جائے۔ لیکن جس وقت اسے محسوس ہوتا ہے کہ سچائیوں کے سامنے آنے کی اُس میں ہمت نہیں ہے تو وہ اُن کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ طنز ہمیں اس بُزدلی کا احساس دلانے کے لئے وجود میں آتی ہے اور یوں ہم زندگی کے سنگین حقائق سے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن طنز کا انداز بظاہر محبت بھرا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس بڑا عتاب آمیز قسم کا ہوتا ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر طنز کو میں گالی سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ طنز خواہ کتنی بھی لطیف کیوں نہ ہو اُس میں گالی کا سا تیز ابی اثر ضرور موجود رہتا ہے۔

گالی شفاف سے شفاف ہو یا غلیظ سے غلیظ ترین اُس میں اتنی چمک دمک ہمیشہ باقی رہتی ہے کہ وہ اپنے جھانکنے والے کو اُس کی صورت کا کوئی جلوہ دکھا دے۔ ہر گالی ایک آئینہ ہے۔ یہ آئینہ گرد آلود بھی ہو سکتا ہے اور مدھم بھی لیکن اس کی ایک صفت ایسی ہے جو اسے دوسرے آئینوں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ صفت یہ ہے کہ گالی کا آئینہ شکستہ نہیں ہوتا۔ شاید اسی وجہ سے گالی ہمیشہ دل میں کھٹکتی رہتی ہے۔ بہر حال گالی کی طرف توجہ دی جائے تو یہ ہمیں حقائق کے بہت سے رنگ دکھا سکتی ہے۔

دشنام کے آئینے میرے طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ایک طرح سے میں ان مضامین کو طنزیہ انشائیے بھی کہہ سکتا ہوں۔ لیکن چونکہ انشائیہ کے بارے میں میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ انشائیہ نگار جس وقت انشائیہ تحریر کرنے بیٹھتا ہے تو اُس وقت اُس کے ذہن میں موضوع کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اسی لئے میں اپنے ان مضامین کو انشائیہ کہنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ یہ مضامین لکھتے وقت میرے ذہن میں طنز لکھنے کی واضح خواہش اور واضح تصور موجود تھا۔ میں سمجھتا ہوں غیر ارادی طور پر طنز، مزاح، فلسفہ وغیرہ انشائیہ میں شامل ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر انشائیہ تحریر کرنے سے قبل اس قسم کی کوئی چیز ذہن میں موجود ہے تو پھر ایسی تحریر کو ہم انشائیہ نہیں کہہ سکتے۔

میرے ان طنزیہ مضامین کی طنز کو اس اعتبار سے تو محدود کہا جا سکتا ہے کہ اس کا تعلق ساری دنیا کے انسانوں سے نہیں بلکہ ایک خاص مُلک اور ایک خاص معاشرہ کے افراد سے ہے لیکن اس طنز میں جو دُکھ بکھرا پڑا ہے اُسے ہم یقینی طور پر انسان کا دُکھ کہہ سکتے ہیں۔ میں نے جس جس انداز میں دُکھ اُٹھائے ہیں اُن کا اظہار اپنی دانست میں بڑی حد تک بے تکلفی سے کر دیا ہے۔ میں اِس اظہار میں کہاں تک کامیاب ہوُا ہوں اِس کا فیصلہ تو پڑھنے والے ہی کریں گے لیکن اِس ضمن میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں کوئی بڑا لکھنے والا ہوتا تو یقیناً اپنے دُکھوں کا اظہار اس سے زیادہ مؤثر اور زیادہ عمدہ طریقے سے کرتا۔

قائدِ اعظمؒ کی تصویر

ایک عرصے سے مجھے یہ آرزو بے چین کر رہی تھی کہ میں بھی اپنے مکان میں قائداعظمؒ کی تصویر لاکر سجاؤں۔ پچھلے دنوں بازار سے ایک تصویر خرید کر لے آیا۔ اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ اسے کس جگہ لگایا جائے۔ بڑی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ تصویر میرے کمرے میں آویزاں ہوگی ـــــ یہ لیجئے صاحب، تصویر لگا دی گئی۔ اپنے کمرے میں آرام کے لئے بستر پر دراز ہوا، تو قائدِ اعظمؒ کی تصویر میرے سامنے تھی۔ لمحہ بھر کے لئے تکمیلِ آرزو پر بے پناہ مُسرّت ہوئی، لیکن یہ لمحہ ابھی گزرنے بھی نہ پایا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے قائداعظمؒ کا موڈ تصویر میں کچھ ٹھیک نہیں۔ میں نے جونہی تصویر کو ذرا غور سے دیکھا، مجھے اس سے خوف آنے لگا۔ قائدِ اعظمؒ تو مجھے باقاعدہ ڈانٹ رہے تھے۔ میں نے نہایت لجاجت سے عرض کیا: "جناب...... جناب........ میں آپ کا...... آپ کا خادم...... حقیر و عاجز...... دل سے مدّاح...... دن رات آپ کے گُن گانے والا۔ آپ مجھ سے ناراض کیوں ہیں؟"

قائداعظمؒ کی تصویر سے آواز آئی:

"اوّل تو ہمیں تمہارا یہ ہانپتے کانپتے اور ڈر ڈر کر ممیاتے ہوئے بات کرنے کا انداز ہی پسند نہیں دوم تم دن رات ہمارے گن گاتے ہو، مگر ہم صرف باتوں کے کبھی قائل نہیں ہوئے۔ خالی پھیکی تعریف سے ہماری روح کو تکلیف پہنچتی ہے ـــــ ہمارے گن گانے کے بجائے ہمیں عمل میں لانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن میں نے دیکھا قائد اعظمؒ کی تصویر اس بار مجھے زور سے دھمکا کر کہہ رہی ہے:

"خاموش رہو ــــــــ فضول وقت مت ضائع کرو۔"

میں نے فوراً گھر والوں سے کہا: "بھئی قائدِ اعظمؒ کی تصویر کو کھلا کیوں رکھ چھوڑا ہے ــــ اس پر کوئی نقاب ڈال دو ــــ" مجھے لاکھ سمجھایا گیا کہ نقاب ڈالنا تھا تو تصویر لانے کی کیا ضرورت تھی، لیکن میں نے یہی جواب دیا: "بڑے آدمیوں کی تصویروں پر بطور احترام نقاب ڈالنا ضروری ہے نقاب کی بدولت وہ گرد و غبار سے بھی محفوظ رہے گی۔" مجھے یقین دلایا گیا کہ گرد بالکل نہیں پڑنے دی جائے گی، لیکن میں نے قائدِ اعظمؒ کی تصویر پر نقاب ڈلوا کر ہی دم لیا۔

اس واقعے کو قریباً ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک روز میں اپنا کمرہ صاف کر رہا تھا جیسے ہی قائدِ اعظمؒ کی تصویر سے نقاب ہٹا، قائدِ اعظمؒ کی گرجدار آواز میرے کانوں میں آئی: "تمہارا کیا حال ہے؟" میں نے جواب دیئے بغیر جلدی سے تصویر کو ڈھانپ دیا۔ مجھے افسوس ہوا کہ قائدِ اعظمؒ نے میرا مزاج نہیں پوچھا بلکہ میری پوری زندگی پر سوال کر ڈالا ہے۔ میں نے اس کے بعد کمرے کی صفائی کرنا چھوڑ دی۔ ان تمام احتیاطوں کے باوجود جب کبھی قائدِ اعظمؒ کی تصویر سے کپڑا سرکتا اور اس کی جھلک نظر آتی، قائدِ اعظمؒ مجھ پر کوئی نہ کوئی سوال ضرور کر ڈالتے۔ میں نے اب اپنے کمرے میں نظریں اٹھا کر دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔

دسمبر کا مہینہ آیا۔ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ قائدِ اعظمؒ کی تصویر میرے کمرے میں جگمگا رہی ہے۔ میں نے گھبرا کر گھر والوں سے پوچھا: "ارے اس کا نقاب کہاں چلا گیا؟" جواب ملا: "یہ مہینہ قائدِ اعظمؒ کی یاد منانے کا ہے، اس لئے تصویر پر سے نقاب اٹھا دیا گیا ہے۔ اب پورے مہینے یہ تصویر اسی طرح کھلی رہے گی۔" اپنے آپ کو مجبور پا کر خاموش ہو رہا اور یہ کہہ کر دل کو تسلی دی کہ کوئی بات نہیں، اوپر بالکل نہیں دیکھوں گا ــــ ایک مہینے کی مدت ہوتی ہی کتنی ہے؟

یوں تو ماہ رمضان میں ہر افطاری پر خاص لطف حاصل ہوتا رہا، لیکن اس روز چیزیں کچھ زیادہ ہی مزیدار پکی تھیں ـــــ معمولات سے فارغ ہو کر کبھی گنگناتا اور کبھی سیٹی بجاتا ہوا نہایت عمدہ موڈ کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ سوچا آج تو کچھ شعر بھی کہے جائیں گے، مگر بستر میں نیم دراز ہو کر جونہی غیر ارادی طور پر سامنے نظر ڈالی، تو قائد اعظمؒ کی تصویر پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھی۔ آواز آئی: "مسٹر، آج تمہیں خالی نہیں چھوڑا جائے گا۔ تم نے اپنے آپ کو بچانے کی بہت کوشش کر لی۔" میں جواب میں یہ کہنے ہی والا تھا: جناب، میری حیثیت ہی کیا ہے، میں تو ایک معمولی سا مدرس ہوں، لیکن میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا اور مجھے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے مجھ پر مختلف حیثیتوں کے روپ وارد ہو رہے ہیں۔ سب سے پہلے احساس ہوا جیسے میں ایک کلرک ہوں۔ بس اس احساس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں قائد اعظمؒ کی تصویر سے آواز آئی: "تم اپنا فرض بخوبی سرانجام دیتے ہو؟" میں نے عرض کیا: "جی ہاں، جتنا کام کرنا ہوتا ہے کر لیتا ہوں۔" آواز گونجی: "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے جناب والا جن فائلوں سے کچھ ملتا نظر آتا ہے، انہیں جلد نمٹا دیتا ہوں۔"

"اور باقی کا کیا ہوتا ہے؟" آواز نے غصے سے دریافت کیا۔

"انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

"تمہارے حکام بالا کچھ نہیں کہتے؟"

"جناب، انہیں کچھ معلوم نہیں۔ اگر کوئی کام سے واقف بھی ہوتا ہے تو وہ بھی وہی فائلیں نکالتا ہے جن سے اُسے کچھ حاصل ہوتا دکھائی دے۔"

"کیا حکام بالا کام نہیں کرتے؟"

"جناب، اگر وہ کام کریں تو پھر ہمارا یہ حال کیوں ہو ـــــ انہیں تو کام سے زیادہ آرام کا خیال ہے۔"

میں نے دیکھا میرے اس جواب پر قائد اعظمؒ کی تصویر پر ایک مسکراہٹ سی کھیل گئی۔ ادھر میں

نے یہ محسوس کیا کہ میں سی۔ ایس۔ پی افسر بن گیا ہوں ـــــ اس تبدیلی کے ساتھ ہی قائدِ اعظمؒ کی تصویر سے آواز آئی: "کہیے صاحب بہادر! آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

میں نے سی۔ ایس۔ پیانہ لجاجت، شائستگی اور تبسم کے ساتھ نظریں جھکا کر جواب دیا:

"سر! آپ کی نوازش ہے ویسے ہمارے ملک کے لوگ بڑے بدتمیز ہو گئے ہیں۔ ہم سے اس طرح بات کرتے ہیں جیسے ہم اُن کے خادم ہوں"

"تم اپنے آپ کو اور کیا سمجھتے ہو؟"

"دیکھئے نا سر! ہم انتظامیہ کے آدمی ہیں۔ اگر ہمارے اور عام لوگوں کے درمیان ایک فاصلہ نہ رہے تو ملک کا نظم و نسق کیسے چل سکتا ہے؟"

"خوب . . . خوب . . . . . . اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم لوگوں نے آزادی کے بعد ذہنی طور پر ذرا بھی ترقی نہیں کی ـــ تم ابھی تک انگریزوں کی غلامی کئے چلے جا رہے ہو ـــ لکیر کے فقیر ہو ـــ تُف ہے تمہاری اس حیثیت پر!"

"نہیں سر . . . . نہیں سر . . . . ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم نے یہ ضروری سمجھا کہ حفاظت کی دیواریں اپنے گرد کھڑی کر لی جائیں۔ اس طرح ہمیں آزادی سے کام کرنے کے زیادہ مواقع میسر آئیں گے۔"

"تمہیں اپنے اس رویے پر شرم آنی چاہئیے"۔ قائدِ اعظمؒ کی تصویر سے یہ فقرہ اس زور سے آیا کہ میں کانپ اٹھا اور میری افسری کا سارا نشہ چشمِ زدن میں ہرن ہو گیا۔ دوسرے لمحے تصویر کی طرف دیکھا، وہ اسی شان سے مسکرا رہی تھی۔ اس بار میں نے محسوس کیا کہ میں ایک سیاستدان بن گیا ہوں۔ تصویر کی جانب سے سوال ہوا: "ہیلو! مسٹر! تم ان دنوں کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔ کیا تمہیں اپنے علاقے کا کوئی بڑا مسئلہ درپیش ہے؟"

"جی نہیں، جناب والا، علاقے کے مسئلے پر اس وقت تک کیسے سوچا جا سکتا ہے جب تک انسان کا اپنا مسئلہ حل نہ ہو جائے۔ میں نے سوچا ہے دو چار فیکٹریاں، چند سو ایکڑ زمین اور ایک دو پرمٹوں کا

کا انتظام ہو جائے پھر اطمینان کے ساتھ ملک کی خدمت پر توجہ دوں گا۔"

"پیٹ کی فکر تمہیں سیاست میں آنے سے پہلے کرنی چاہیئے تھی"۔

"جناب، آپ سے کیا چھپاؤں۔ میں تو سیاست میں آیا ہی شکم پروری کے لئے ہوں۔ ملک کی خدمت والی بات تو محض ایک بہانہ ہے۔"

"تمہاری یہ دیدہ دلیری مجھے قطعی پسند نہیں۔ اگر تم سیاست ایسی ذمہ دار، باوقار اور کٹھن چیز کو عیش و آرام اور رنگ و نام کا ایک ذریعہ سمجھتے ہو تو فوراً اس سے کنارہ کش ہو جاؤ۔"

میرے سر سے سیاست کا بھوت جلد ہی اتر گیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو انجینئر کے روپ میں دیکھا۔ میں قائدِ اعظمؒ سے کہہ رہا تھا: "جناب والا، لوگ ہمارے شعبے کو بہت بدنام کرتے ہیں حالانکہ ہمیں کمیشن پانچ فی صد سے زیادہ حاصل کرنے کا موقعہ کبھی ملتا ہے۔ ہم سے زیادہ رشوت دوسرے محکمے کھاتے ہیں، ہم تو خواہ مخواہ بدنام کر دیئے گئے ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ ہماری بنائی ہوئی سڑکیں، پُل، عمارتیں خراب ہوتی سب کو نظر آتی ہیں، دوسرے شعبوں کی خرابیاں اس طرح نظر نہیں آتیں، ورنہ جناب . . . . ہم انجینئر بیچارے بہت کام کرنے والے محنتی لوگ ہیں۔ قوم کی زیادہ تر ترقی اور خوشحالی کا دارومدار ہماری ذات پر ہے، لیکن لوگ ایسے طوطا چشم واقع ہوئے ہیں کہ ذرا سی دیر میں آنکھیں پھیر لیتے ہیں اور ہماری قدر نہیں کرتے۔"

"کچھ حیا کرو، تم پر تو یہ مثال صادق آتی ہے کہ اپنی آنکھ کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا اور دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی شہتیر دکھائی دیتا ہے۔"

میں نے قائدِ اعظمؒ کی آواز سنتے ہی انجینئری کا چولا یکدم اتار پھینکا۔ اب میں ڈاکٹر بن گیا تھا۔ قائدِ اعظمؒ کی تصویر کہہ رہی تھی:

"کیوں ڈاکٹر، تمہارے اخلاق کو کیا ہوا؟"

میں نے جواب دیا: "سر بہت اچھا ہے۔"

"ذرا سوچ سمجھ کر جواب دو۔"

"جی ..... جی ....."

"کیا جی ...... جی ..... کر رہے ہو؟ لوگوں کو دھیان سے دیکھتے نہیں ـــــ دوا ٹھیک نہیں دیتے ـــــ اور فیس زیادہ وصول کرتے ہو"۔

میں نے ہمت کر کے کہا: "دیکھئے ناسر، پہلی بات یہ ہے کہ لوگ بیمار ہی کیوں پڑتے ہیں۔ ذرا احتیاط کریں تو ان کی صحت اچھی رہ سکتی ہے۔ انہیں اپنی بے پروائی کی سزا بھگتنی چاہیئے۔ ہم ڈاکٹر لوگ ان سے کب کہتے ہیں کہ وہ ہمارے پاس آئیں۔ مریضوں کو ہم اسی لئے غور سے نہیں دیکھتے کہ کہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہمیں اُن سے یا اُن کی بیماری سے کوئی دلچسپی ہے"۔

میں نے ایک لمحہ تامل کیا اور پھر کہا: "اور جناب، ہماری بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ اگرچہ دیہات میں کام کرنے اور اپنے جوہر دکھانے کے زیادہ مواقع میسر آسکتے ہیں، لیکن ہم وہاں نہیں جاتے۔ بس شہروں میں رہنا پسند کرتے ہیں تاکہ ہماری بے نیازی کا پڑھے لکھے لوگوں میں خوب چرچا ہو جائے"۔

"مجھے اس قسم کی لغو گفتگو قطعی پسند نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ مزید ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالو"۔

میں بُری طرح سہم گیا۔ اب میں ایک وکیل کے روپ میں قائداعظم کی تصویر کے سامنے کھڑا تھا۔ قائداعظم کی آواز مجھ سے پوچھ رہی تھی: "تمہیں معلوم ہے ایک وکیل کا سب سے بڑا فرض کیا ہے؟"

"می لارڈ، سچ سچ عرض کر دوں؟"

"ہاں ..... ہاں ..... بولو، میں حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں"۔

"عرض یہ ہے ..... می لارڈ، واقعی جو صحیح بات ہے وہ کہہ دوں"

"بولو ..... بولو ..... ڈرو مت ..."

"جناب میرے خیال میں وکیل کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ مؤکل کو خوب سبز باغ دکھائے اور جو مقدمہ اس کے پاس آجائے، اسے ہاتھ سے نہ جانے دے، خواہ مقدمہ جاندار ہو یا بے جان۔ فیس پوری ملتی ہو یا آدھی ..... بے ضمیری اور عیاری وکالت کو خوب چمکاتی ہے"۔

"مشکور!"

"می لارڈ"۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جی ۔ ۔ ۔ ۔"

"وکالت کا پیشہ دیانت اور صدق و صفا کا پیشہ ہے ۔ وکیل کا بنیادی فرض عدالت کو انصاف تک پہنچنے میں مدد کرنا ہے ۔ اس میں عیاری کا کیا کام؟"

اب مجھ میں ذرا حوصلہ ہوا اور میں نے جی کڑا کر کے کہا :

"معاف کیجئے جنابِ والا' اگر وکیل اپنے مقدمے کے کمزور پہلو نہ چھپائے اور حقیقت کا اظہار کر دے' تو پھر اسے کون وکیل بنائے گا؟ اور وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کیسے بھرے گا؟ اس کے علاوہ عدالت کے پاس واقعات کو غور سے سننے اور پرکھنے کا وقت کہاں ہے؟"

"بکواس بند کرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنا بوجھ دوسرے کے کاندھے پر ڈالنا چاہتے ہو ۔ محنت سے خود کام نہیں لیتے' مقدمے کا خود اچھی طرح مطالعہ نہیں کرتے اور الزام لگاتے ہو عدالت پر"۔

اس آواز کی روشنی میں وکالت کے پیشے پر غور کر ہی رہا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے میں وکیل سے صحافی بن گیا ہوں ۔ قائداعظمؒ کی آواز گونجی : "مسٹر' تم اپنے قلم سے صحیح کام نہیں لے رہے ہو"۔

"کیا عرض کریں جناب' ہمارا قلم ہمارے ہاتھ میں نہیں"۔

"یہ کہنا چاہتے ہو کہ حق بات کہنے کی اجازت نہیں؟"

"بالکل جناب ۔ ۔ ۔ ۔ بالکل"۔

"تمہارا یہ خیال غلط ہے ـــــ حق بات کہنے پر کبھی کوئی پابندی عائد نہیں ہو سکتی' بشرطیکہ کوئی سچ کہنے والا ہو ۔ سچ تو صبح کے سورج کی طرح سامنے آتا ہے' البتہ سچ کا اظہار سلیقے کا تقاضا کرتا ہے ۔ یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرو کہ سچ بات کہنے کے لئے انسان کا بے لوث ہونا لازمی ہے ۔ غرض مندی سے ابھرنے والا سچ اپنا اثر زائل کر دیتا ہے ۔ اگر تم تعمیری نقطہ نظر سے ملک اور قوم پر کڑی سے کڑی تنقید بھی کر دو گے' تو کوئی روکنے والا نہ ہو گا اور بالفرضِ محال اس راہ میں تمہیں ایثار بھی کرنا پڑے' تو آخر گریز کی راہ کیوں اختیار

کرتے ہو؟"

یہ گفتگو سن کر مجھے خیال آیا کہ صحافت اختیار کرنا تو گویا اپنے آپ کو مسلسل امتحان میں ڈالے رکھنا ہے یہ خیال آتے ہی میرے صحافی بننے کی حیثیت ختم ہو گئی۔ اب میرے دل میں منصف بننے کی خواہش سر اٹھا رہی تھی۔ میں اس کا اظہار کرنے والا ہی تھا کہ قائدِ اعظم کی تصویر سے پھر آواز آئی:

"شکور! ایک عدلیہ ہی ایسا شعبہ ہے جو نااہلوں سے بچا ہوا ہے۔ اب تم ایسے لوگ اُسے بھی خراب کرنا چاہتے ہیں۔ نہ زبان پر تمہیں قدرت نہیں، تعصب سے تم بلند نہیں، واقعات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، پھر کس برتے پر منصف بننے کے خواب دیکھتے ہو؟"

میں نے کہا: "جناب! میں منصف بنا تو نہیں، صرف اس کی خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ اس میں جُرم کی کیا بات ہے، ہم خواہش تو ہر قسم کی کر سکتے ہیں۔"

"معاشرے میں تمام خرابیاں اسی وجہ سے اُبھرتی آرہی ہیں کہ تم غیر ضروری خواہشات کے غلام بن گئے ہو۔ مشہور مقولہ ہے: پہلے اہل بنو، پھر خواہش کرو۔"

اگرچہ قائدِ اعظم کی یہ بات میری سمجھ میں اچھی طرح نہ آسکی، تاہم میں نے جج بننے کی خواہش سے توبہ ضرور کر لی۔ اس کے بعد مجھ پر پھر کئی حیثیتیں طاری ہوئیں، لیکن میں ہر حیثیت کے ساتھ قائدِ اعظم کی نظر میں ناقص اور نااہل ثابت ہوا۔ سب سے آخر میں عرض کیا: "جناب والا! میری اس حیثیت میں تو آپ کوئی کمی نہیں پائیں گے کہ میں ایک عام پاکستانی فرد ہوں۔"

دوسری طرف سے آواز آئی: "مجھے تمہاری یہ حیثیت سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں تمہاری اس حیثیت کو سب سے زیادہ احترام اور محبت کی نظر سے دیکھتا ہوں، لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک سچا پاکستانی کہلانا بہت بڑی ذمے داری سر مول لینے کے مترادف ہے۔ تم وزیر، امیر، کمشنر، ڈاکٹر، بیرسٹر، جج سب کچھ آسانی سے بن سکتے ہو، لیکن سچا پاکستانی بننے کی بنیادی شرط ایثار اور قربانی ہے..... کیا تم نے اس مسئلے پر پوری طرح غور کر لیا ہے؟"

"جی ہاں، جناب عالی!"

تصویر ایک بار پھر مسکرائی اور آواز آئی: "اچھا کیا تمہیں یاد ہے میں نے ۱۵ جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ میونسپلٹی کے استقبالیہ میں کیا بات کہی تھی؟"

"جی ..... جی ..... جناب ..... کچھ یاد نہیں آتا۔"

"تو سنو ..... میں اپنے وہ الفاظ ایک بار پھر دُہراتا ہوں ..... میں نے کہا تھا: اب ہم پاکستانی ہیں۔ نہ بلوچی، نہ پٹھان، نہ سندھی، نہ بنگالی، اور نہ پنجابی ——— ہمیں پاکستانی اور صرف پاکستانی کہلوانے پر فخر ہونا چاہیئے ——— ہم جو کچھ محسوس کریں، جو عملی قدم بھی اٹھائیں، وہ پاکستانی اور فقط پاکستانی کی حیثیت میں اٹھایا جائے۔ میں آپ سے کہتا ہوں کوئی نیا اقدام کرنے سے پہلے رُک کر ذرا سوچ لیں کہ یہ اقدام آپ کی ذاتی یا مقامی پسند اور ناپسند کے زیرِ اثر ہے یا پاکستان کی فلاح و بہبود کا خیال دوسری سب باتوں پر غالب ہے۔"

تصویر نے رُک رُک کر کہا: "میں پوچھنا چاہتا ہوں کیا تم علاقائی تعصب سے بلند ہو گئے ہو؟ کیا واقعی تم میں وُسعتِ نظر اور وُسعتِ قلب پیدا ہو گئی ہے جس کا میں متمنی تھا ——— یا صرف تم لوگ میری تصویریں دفتروں اور گھروں میں لٹکا کر ہی خوش ہو لیتے ہو ——— اور سال بھر میں ایک دو دفعہ میری یاد میں چھوٹے موٹے جلسے منعقد کر کے اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتے ہو ——— یاد رکھو میری روح محض تصنّع، دکھاوے اور بے عملی سے کبھی خوش نہیں ہو سکتی۔"

میں نے گھبرا کر کہا: "قائدِ اعظمؒ، میں تو ایک معمولی سا مدرس ہوں اور مجھے اپنی وہی حیثیت قبول ہے۔"

تصویر کی طرف سے پھر آواز آئی: "تم بزدل ہو، تنگ نظر ہو ——— تمہیں خود غرضی اور ہوس نے مار رکھا ہے۔ ایسی حالت میں تم خود کو کسی حیثیت کے شایانِ شان نہیں بنا سکتے۔" میں نے خوف اور غیرت کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر چلانا شروع کر دیا:

"قائدِ اعظمؒ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ ..... یہ آپ ....."

"ارے کلمہ پڑھو ..... کلمہ پڑھو ....." مجھے گھر والوں نے جگایا۔ میں نے دیکھا سب لوگ میرے کمرے میں جمع ہیں اور زیرِ لب مسکرا رہے ہیں۔ میری ننھی بیٹی کہہ رہی تھی:

"ابّی جان، آپ ہمیں تو منع کرتے ہیں کہ افطار کے وقت کم کھانا کھانا چاہیئے اور خود زیادہ کھاتے ہیں۔ تبھی تو سرِ شام آپ کو ڈراؤنے خوابوں نے گھیر لیا ہے"۔

میں نے کہا "جلدی سے قائدِ اعظمؒ کی تصویر پر نقاب ڈال دو"۔

سب مجھ سے جھگڑنے لگے: "آخر آپ کو قائدِ اعظمؒ کی تصویر سے کیا دشمنی ہے؟ غالباً آپ ابھی تک سو رہے ہیں۔ کلمہ پڑھیئے اور جاگ جائیے"۔

میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا: "میں بالکل بیدار ہوں۔ قائدِ اعظمؒ کی تصویر کو ڈھانپ دو، ورنہ میں تم لوگوں سے بُری طرح پیش آؤں گا۔ میں اپنے گھر کا بادشاہ ہوں، یہاں میری مرضی چلے گی۔ تم میں سے کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں"۔

تمام گھر والے تصویر حیرت بنے مجھے تک رہے تھے۔ اُس دن سے قائدِ اعظمؒ کی تصویر پر باقاعدہ نقاب پڑا ہوا ہے۔ میرے بیٹے، میری اولاد گھر میں یوں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں، لیکن قائدِ اعظمؒ کی تصویر سے نقاب اٹھانے کی کسی میں ہمت نہیں۔

شہر کا اندیشہ

نام ان کا بھلا ... ہیں آرہا، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میری اور ان کی ملاقات کوئی آج کی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ۱۹۴۸ء کا زمانہ تھا۔ میں قلعہ لچھمن سنگھ لاہور میں اپنے چند عزیزوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ستمبر کی ایک صبح کا ذکر ہے۔ میں ابھی اپنے بستر ہی میں تھا کہ گلی میں کسی کے دھاڑیں مار مار کر رونے کی آواز آئی۔ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا، تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہی محلے کے ایک نہایت سنجیدہ اور متین شخص گریہ کناں ہیں۔ وہ مسلسل کہے جا رہے تھے ،

''ہم لٹ گئے، ہم مر گئے، اب کیا ہوگا؟''

لوگوں نے تسلی دیتے ہوئے پوچھا: ''آخر کچھ بتائیے تو سہی ہوا کیا؟''

وہ اسی طرح روتے ہوئے بولے: ''ہونا کیا تھا، قائدِ اعظمؒ ہم سے جدا ہوگئے۔ ہمیں بے سہارا چھوڑ گئے۔''

یہ بُری خبر سن کر سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُن صاحب کا کچھ زیادہ ہی بُرا حال تھا۔ میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا: ''میرے محترم ہمت سے کام لیجئے۔ قائدِ اعظم آج ہم میں نہیں، تو کیا ہوا، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

وہ ایک دم خاموش ہو کر بولے: ''اللہ یقیناً ہمارے ساتھ ہے، لیکن کوئی لیڈر بھی تو ہونا چاہیے۔''

''وہ بھی کوئی نہ کوئی ہو جائے گا۔''

''کون؟'' انہوں نے پوچھا اور جب میں جلدی سے کوئی جواب نہ دے سکا، تو خود ہی بولے :

"اے بھائی، قائدِ اعظمؒ کے بعد مجھے کوئی نظر نہیں آتا۔ دیکھتے ہیں یہ خلا کب پُر ہوگا یا کبھی ہوگا ہی نہیں ـــــ ہماری قوم کو نہایت زیرک اور بے لوث راہنما کی ضرورت ہے، ورنہ سخت خطرہ ہے کہ ہم لوٹ مار میں پڑ کر خود کو تباہ نہ کر ڈالیں"۔ وہ یہ کہہ کر لمحہ بھر خاموش رہے، پھر روتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے۔

اس واقعے کے بعد وہ ہر وقت پریشان رہنے لگے۔ ان کا اصل نام کیا ہے، مجھے ہی نہیں بلکہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کسی کو بھی یاد نہیں رہا۔ وہ اپنے اصلی نام کے بجائے علامہ پریشان کے نام سے مشہور ہو گئے۔ انہوں نے پریشانی کو اس حد تک اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا کہ نہ صرف لوگ انہیں پریشان کہہ کر پکارنے لگے، بلکہ وہ خود اپنا تعارف بھی اسی نام سے کراتے۔ ٹیلیفون پر اگر کوئی ان سے پوچھتا: "کون صاحب بول رہے ہیں"، تو وہ فوراً جواب دیتے: "پریشان بول رہا ہوں"۔

۱۹۴۸ء کے بعد مجھے ملازمت کے سلسلے میں لاہور سے باہر جانا پڑا، کبھی لائلپور، کبھی ملتان اور کبھی شیخوپورہ وغیرہ وغیرہ، لیکن علامہ پریشان سے میری اکثر ملاقات ہوتی رہتی۔ میں نے انہیں جہاں بھی اور جب بھی دیکھا پریشان دیکھا۔ ان کی پریشانی کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ اپنی وضع قطع اور لباس کی وجہ سے ایسے نظر آتے تھے۔ اُن کے جوتوں پر پالش بھی ہوتی، اُن کا لباس بھی صاف ہوتا، وہ سر پہ ٹوپی بھی باقاعدہ رکھتے، اُن کی حجامت بھی بڑھی ہوئی نہ ہوتی ـــــ لیکن وضع قطع میں اس تمام باقاعدگی کے باوجود ان کی حرکات و سکنات اور چہرے سے صاف طور پر پتہ چلتا تھا کہ وہ سخت پریشان ہیں۔ کھوئے کھوئے اور گھبرائے گھبرائے سے۔ اُن کی آنکھوں سے عجیب طرح کی ویرانی جھلکتی تھی۔

اُن کے دو لڑکے تھے اور دونوں ہی ماشاءاللہ بہت لائق و فائق۔ بڑے لڑکے نے انجنیرنگ کا امتحان خاص پوزیشن لے کر پاس کیا۔ ہم مبارکباد دینے کے لئے علامہ پریشان کے گھر پہنچے، تو انہیں سخت پریشان پایا۔ میں نے کہا،

"قبلہ مبارک ہو"۔

انہوں نے حیران ہو کر پوچھا: "کس بات کی؟"

"صاحبزادے نے امتحان پاس کیا ہے اور بڑے اچھے نمبر لے کر"۔

"یہ تو مبارکباد دینے کا کوئی موقع نہیں"۔

"اچھا، اب سمجھا، غالباً آپ کا خیال ہے جب ملازمت مل جائے اس وقت مبارک باد دی جائے لیکن۔۔۔۔۔۔"

وہ میری بات کاٹ کر بولے :

"عزیزم، اتنا تو مجھے بے وقوف نہ سمجھو میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ملازمت فوراً مل جائے گی، ابھی ملک کو انجنیروں کی ضرورت ہے"۔

"پھر آپ ہماری مبارکباد قبول کیوں نہیں کرتے"؟

"کیسے قبول کروں۔ میرا خود ایک دوست انجنیر ہے اور دو تین دوستوں کے لڑکے انجنیر ہیں، جس قدر لوٹ مار انہوں نے مچا رکھی ہے میں بیان نہیں کر سکتا"۔

"رشوت کہاں نہیں"؟

"ٹھیک ہے لیکن جس طرح میں نے اپنے انجنیر دوست اور دوستوں کی انجنیر اولاد کو چشم زدن میں دولتمند بنتے اور پھر اس حرام کی کمائی پر فخر کرتے دیکھا، ایسا مشاہدہ مجھے اور کہیں نہیں ہوا"۔

"قبلہ سب جگہ یہی حال ہے"۔

"تم درست کہتے ہو گے، لیکن میں سمجھتا ہوں انجنیرنگ کا معاملہ مختلف ہے۔ انجنیروں کا رشوت لینا ملک کو بہت زیادہ اور واضح نقصان پہنچا سکتا ہے"۔

"رشوت ہر جگہ ملک کو نقصان پہنچاتی ہے"۔

"لیکن میں پھر کہوں گا کہ انجنیرنگ میں رشوت ملک و قوم کی روزانہ زندگی پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے"۔

"مگر یہ کیا ضروری ہے کہ آپ کا فرزند بھی رشوت خور انجنیر بنے"۔

"تمہارا خدا بھلا کرے ــ اب تم نے ٹھیک بات کی، لہذا۔۔۔۔"

"لہذا مبارکباد قبول فرمایئے"۔

"بالکل نہیں۔ ایک انجنیئر پر ابتدائے ملازمت کے دو سال بھاری ہوتے ہیں۔ اگر اس نے پہلے دو برس رشوت نہیں لی، سمجھ لو پھر وہ بچ گیا۔"

"چنانچہ جب آپ کے بیٹے کو انجنیئر بنے دو سال گزر جائیں گے، اس وقت آپ مبارک باد قبول فرمائیں گے۔"

"ممکن ہے تم نے مذاق میں یہ بات کہی ہو، لیکن میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ مبارکباد کا صحیح وقت وہی ہوگا۔ میں نہیں چاہتا میرا بیٹا بودی عمارتیں، کمزور سڑکیں، جلد ختم ہو جانے والے پُل اور اس قسم کی دوسری تعمیرات بنوائے اور ملک کا لاکھوں نہیں کروڑوں روپیہ تباہ کرے۔ تعمیر میں پچاس ہزار روپیہ خرچ نہ آئے اور میرے بیٹے کی جیب میں ایک لاکھ پہنچ جائے۔ میں ایسی کمائی پر لعنت بھیجتا ہوں۔ معلوم نہیں وہ لوگ کتنے بے غیرت اور بے ضمیر ہیں جو رشوت کی کمائی کے بل بوتے پر سوسائٹی میں سر اٹھا کر چلتے ہیں۔ انہیں ایک چلّو پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔"

جب ہم دوستوں نے دیکھا کہ علامہ پریشان تقریر کرنے کے موڈ میں آچلے ہیں، تو اُن سے ضروری کام کے بہانے اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ابھی ہم لوگ دروازے کے پاس بھی نہ پہنچے تھے کہ علامہؒ نے بلند آواز میں کہا:

"دوستو اور عزیزو، دو سال بعد بھی مجھے اس وقت مبارکباد دینے آنا جب اچھی طرح تحقیق کر لو کہ میرا بیٹا حرامی ثابت نہیں ہوا۔"

"حرامی؟ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"میری دانست میں ہر وہ شخص جو رشوت کھاتا ہے صرف حرام خور ہی نہیں، بلکہ حرام زادہ بھی ہے۔"

"یہ آپ زیادتی فرما رہے ہیں۔"

"حرام خوروں کے ساتھ؟"

"جی ہاں۔"

"تو پھر آپ کو کیا؟ میں خود اس کا ذمہ دار ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔

کچھ عرصے بعد علامہ پریشان کے اس انجینیر لڑکے کی شادی کراچی کے ایک بڑے تاجر کے ہاں ہوئی ظاہر ہے دلہن کو بے تحاشا جہیز دیا گیا، لیکن جہیز دیکھ کر علامہ پریشان کی جو حالت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ لوگ جہیز دیکھ کر رشک کر رہے تھے اور علامہ ایک طرف کو سخت بے چینی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر بار بار کہہ رہے تھے:

"یا اللہ، تو میرے خاندان کو اپنے حفظ و امان میں رکھ۔ اے رب العزت تو ہی میری لاج رکھنے والا ہے۔ مجھے اور میری اولاد کو حرام سے بچا، ظلم سے بچا، اب کیا ہوگا، اس سامان کی آفت کو کہاں لے جاؤں گا، کس کے گھر ڈالوں گا۔"

میں نے قریب جا کر کہا:

"قبلہ آپ اس خوشی کے موقع پر کچھ گھبرائے ہوئے سے نظر آ رہے ہیں۔"

"کچھ نہیں، بہت گھبرایا ہوا۔"

"وہ کیوں؟"

"خوب، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آپ جہیز کو دیکھ کر خوش ہوئے؟"

"جی ہاں، بات ہی خوشی کی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم بے حس انسان ہو۔"

"جہیز کو دیکھ کر بے حس ہونا کیسے ثابت ہوا؟ جبکہ جہیز دینے والا صاحب حیثیت فرد ہے۔"

"اول تو جہیز خواہ امیر کی طرف سے ہو یا غریب کی طرف سے اس پر خوش ہونا کسی طرح جائز ہی نہیں، یہ رسم ہی غلط ہے۔ اس کے علاوہ میرے لڑکے کی دلہن کو جو جہیز دیا گیا ہے، میں سمجھتا ہوں یہ بھی حلال کی کمائی نہیں۔"

"آپ کے سمدھی بہت بڑے تاجر ہیں۔"

"مجھے جہیز دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جائز طریقوں سے بڑے تاجر نہیں بنے۔ انہوں نے

نہ جانے کتنے مظلوموں کا حق مار کر یہ مقام حاصل کیا ہے"۔

"پھر آپ سے کس نے کہا تھا کہ اپنے بیٹے کی شادی اس گھر میں کریں"۔

"ایک تو مجھے اِن صاحب کے بارے میں اچھی طرح معلوم نہ تھا' دوسرے انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کوئی خاص جہیز نہیں دیں گے۔ سب سے بڑی مجبوری یہاں شادی کرنے کی یہ تھی کہ لڑکا لڑکی دونوں راضی تھے۔ پھر تم خود ہی بتاؤ مجھ ایسا قاضی کیا کر سکتا تھا"۔

علامہ پریشان کے دوسرے بیٹے نے انگریزی میں فرسٹ کلاس ایم۔ اے کیا اور اگلے ہی سال وہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھ گیا۔ اس نے بھی بڑی شاندار کامیابی حاصل کی۔ ہم پھر مبارکباد دینے گئے۔ علامہ اس وقت بھی حسبِ معمول سخت پریشانی کے عالم میں تھے، کہنے لگے:

"عزیزو' اِس وقت کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہ کرنا۔ تم جانتے ہو مجھے اپنے چھوٹے بیٹے سے کچھ زیادہ ہی پیار ہے، لیکن اب ڈرتا ہوں کہ افسری کی تربیت حاصل کرے گا اور غیر بن جائے گا۔ مجھے اپنے ملک کے افسروں میں جو بات سب سے زیادہ بری لگتی ہے' وہ یہی ہے کہ یہ لوگ خود کو دوسروں سے الگ کوئی مخلوق سمجھنے لگتے ہیں۔ ان میں یگانگت کی خوشبو نام کو باقی نہیں رہتی۔ یہ عوام سے اس طرح بات کرتے ہیں جیسے کوئی غیر ملکی حاکم اپنے محکوموں سے بات کرتا ہے۔ افسروں کی اسی بیگانگی نے ہمیں تباہ کر چھوڑا ہے، لہٰذا میرے بیٹے کے افسر بننے کی خوشی کی مبارکباد اس وقت دینا جب تربیت حاصل کرنے اور کہیں افسر تعینات ہونے کے بعد تم لوگ اُس سے ملاقات کرو اور یہ اُسی طرح تم سے ملے جس طرح آج ملتا ہے۔ اگر اس کی آنکھ ذرا بھی بدلی ہوئی محسوس کرو، تو نہ صرف اسے ایک بھرپور گالی دینا، بلکہ مجھے بھی بے نقط سنا ڈالنا"۔

"آپ نے اسے مقابلے کے امتحان ہی میں کیوں بیٹھنے دیا؟"

"یہ کہتا تھا میں صرف اپنی لیاقت آزمانے کے لئے امتحان دے رہا ہوں۔ اب پاس ہو گیا ہے تو اس کی نیت بدل گئی ہے، اسی لئے میں سوچ رہا ہوں پورا افسر ہو کر کہیں مکمل طور پر ہی نہ بدل جائے"۔

غرض علامہ پریشان ہر خوشی کے موقع پر خواہ وہ اجتماعی ہو یا انفرادی، مجھے کبھی خوش نظر نہ آئے۔ ہمیشہ مضطرب، ہمیشہ حیران اور پریشان —— بے چینی اور اضطراب تو جیسے ان کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ میں نے ایک دن ویسے ہی کہہ دیا: "قبلہ، آپ انفرادی یعنی اپنے گھر سے متعلق مسرت کی تقریبات پر خوش نہیں ہوتے، چلیے اس کا ایک طرح کا جواز نکالا جاسکتا ہے، لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ آپ کسی اجتماعی اور قومی تقریب پر بھی اظہارِ مسرت نہیں فرماتے؟"

فوراً بولے: "عزیزم، قومی اور اجتماعی خوشی کی تقریب کا موقع کب آیا، ذرا ایمان داری سے جواب دینا!"

میں اُن کے اس طرح سوال کرنے پر کچھ گڑبڑا سا گیا، ذرا تامّل کے بعد بولا: "آپ عید کے تہوار پر بھی خوش نہیں ہوتے بلکہ اُلٹے گھبرائے گھبرائے اور بوکھلائے سے نظر آتے ہیں۔"

ہنس کر کہنے لگے: "بات نہیں بنی۔ رہا عید کا سوال، تو وہ روح کہاں موجود ہے جس کی بِنا پر اِن تقریبات کو وجود میں لایا گیا تھا۔ میں ایک کے ساتھ نہیں سب کے ساتھ خوش ہونے کو تیار ہوں، لیکن سب کی خوشی...... ہائے ظالم، یہ تم نے کیا بحث شروع کردی۔ اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔ سب کی خوشی پر میری جان قربان! خدا وہ دن تو لائے، پھر دیکھنا کس طرح خوش ہوتا ہوں —— مگر آہ! آج تک تو ایسا موقعہ نصیب نہ ہو سکا۔"

مشرقی پاکستان کا المیہ پیش آیا، تو ہم اسی روز شام کو علامہ پریشان کا حال دریافت کرنے اُن کے گھر گئے۔ ہمارا خیال تھا اوّل تو علامہ موصوف حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال فرما چکے ہوں گے اور اگر ایسا نہ ہوا ہوگا، تو وہ پاگل ہو کر اپنے ہوش و حواس ضرور کھو چکے ہوں گے، لیکن جیسے ہی ہم اُن کے مکان میں داخل ہوئے، اُن کا ایک ملازم ملا جس نے بتایا کہ وہ خیریت سے ہیں۔ جب ہم نے اُس سے کہا کہ علامہ سے ملنا چاہتے ہیں، تو اس نے جواب دیا: "بزرگوار نے مجھے بتایا ہے کہ وہ آج کسی سے ملاقات نہیں کریں گے۔" ہم یہ سُن کر واپس آگئے۔

ایک ہفتے بعد دوبارہ ملنے گئے، تو علامہ نہایت اطمینان سے لان میں چہل قدمی فرما رہے

تھے۔ ہمیں ان کے چہرے پر دہ پریشانی بھی نظر آرہی تھی جو ان کی زندگی کا معمول بن چکی تھی۔ دل ہی دل میں ہم سب دوست حیران ہو رہے تھے۔ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ تمام قوم کا غم واندوہ سے بُرا حال ہے لیکن علامہ ہیں کہ ضرورت سے زیادہ مطمئن دکھائی دے رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے اُن کی اس کیفیت کو اطمینان نہ کہا جا سکے، تاہم اگر اسے صبر وضبط کی کیفیت بھی کہا جاتا، تو وہ نہایت اعلیٰ درجے کی تھی۔ ہمیں آتا دیکھ کر علامہ نے ڈرائینگ روم کھلوایا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے مشرقی پاکستان کے المیے کا ذکر شروع کیا۔

"آہ! علامہ ہمارے ساتھ کتنی بڑی ٹریجڈی ہو گئی"۔

"کون سی ٹریجڈی؟" انہوں نے جیسے انجان بن کر پوچھا۔

"مشرقی پاکستان کا المیہ"۔

"ہاں، مشرقی پاکستان والی بات بڑے دُکھ کی بات ہے لیکن تمہارے ساتھ کیا ہوا؟"

"ہمارا بُرا حال ہے"۔

"وہ کیسے؟"

"ہم شدت سے اِس المیے کو محسوس کر رہے ہیں"۔

"میرا خیال ہے یہ سب دکھاوا ہے"۔

"علامہ! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ساری قوم رو رو کر نڈھال ہوئی جا رہی ہے اور آپ فرماتے ہیں یہ سب دکھاوا ہے"۔

"میں تم سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟"

"ضرور"۔

"کیا کسی غم کو محسوس کر کے نڈھال ہو جانا اِس بات کی دلیل ہے کہ اس غم کو صحیح طور پر محسوس کر لیا گیا ہے؟"

"آپ نے ذرا مشکل سوال کیا ہے"۔

"مشکل سے گھبراتے کیوں ہو"۔

"ایسی بات نہیں"

"پھر سوچ کر جواب دو"

"بات یہ ہے کہ غم انسان کو نڈھال بھی تو کرتا ہے"

"اگر غم کو صحیح طور پر محسوس کیا گیا ہو، تو پھر وہ نڈھال نہیں کرتا"

"آپ کا خیال ہے غم انسان کو طاقت بخشتا ہے"

"اس میں کیا شک ہے۔ غم کا صحیح احساس ایک غمگین شخص کو نیا عزم اور نیا ولولہ عطا کرتا ہے"

"ہماری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آئی"

"تمہاری سمجھ میں میری بات کیسے آسکتی ہے تم لوگ خود غم کو صحیح طور پر محسوس کرنے سے گریز کر رہے ہو"

"علامہ صاحب، حد ہو گئی لوگوں کو کھانا پینا اچھا نہیں لگتا۔ انہوں نے ہنسنا بولنا ترک کر دیا۔ ایک درد و کرب کی فضا ہے کہ پوری ملت پر چھائی ہوئی ہے۔ آپ فرما رہے ہیں کہ لوگوں نے غم کو محسوس ہی نہیں کیا"

"رونا دھونا، کھانا پینا اور معمولاتِ زندگی کو ترک کرنا، آہیں بھرنا اس بات کی علامت ہے کہ لوگ غم کو محض آنسوؤں اور آہوں میں اڑا دینا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ آنسو بہا کر اور ہائے ہائے کر کے اُن کی ذمہ داری ختم ہو گئی"

"معاف کیجئے قبلہ، آپ کی بات میں ذرہ برابر سچائی نہیں۔ کوئی مثال دے کر اپنی گفتگو کی وضاحت فرمائیے"

"تم مثال چاہتے ہو؟"

"جی ہاں اگر آپ دے سکیں"

"بُرا تو نہ مانو گے؟"

"مثال سے بُرا ماننا کیا معنی؟"

میرے اس کہنے پر علامہ ہم سب دوستوں سے مخاطب ہوئے

"میں پوچھتا ہوں کیا واقعی تم لوگوں نے مشرقی پاکستان کے المیے کو محسوس کیا ہے؟"

"اب کیا بتائیں ہم پر کیا گزری ہے۔"

"جھوٹ بول رہے ہو، تم پر کچھ بھی نہیں گزرا۔"

"سینہ چیر کر نہیں دکھایا جا سکتا۔"

"اس چیر پھاڑ کی قطعی ضرورت نہیں۔ ابھی پتہ چل جاتا ہے۔ تم کہتے ہو تم نے اس المیے کو شدت سے محسوس کیا ہے۔"

"جی ہاں۔"

"اگر یہ بات ہے تو خدا کو حاضر ناظر جان کر مجھے بتاؤ کہ اس المیے کے احساس نے تمہاری سیرت اور کردار میں کیا تبدیلی پیدا کی ہے؟"

"تبدیلی؟" ہم سب کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں تبدیلی، اب تم لوگوں کو سانپ کیوں سونگھ گیا ——جواب کیوں نہیں دیتے؟"

اور واقعی علامہ کے اس سوال پر ہم سب لوگ خاموش تھے۔ علامہ باری باری میرے دوستوں سے خطاب کرنے لگے:

"کیوں بھئی بڑے بیوپاری صاحب تم اسی "ایمانداری" سے بیوپار کر رہے ہو جیسے پہلے کرتے تھے" ——

"اور ہاں وکیل صاحب آپ کی وکالت کا کیا حال ہے؟ کمزور مقدمے لیکر انہیں کامیاب بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ گواہوں کو بھی پہلے کی طرح ہی تیار کیا جاتا ہے —— فیس لیتے وقت غریب اور امیر کا کوئی فرق تو نہیں رکھتے۔" ڈاکٹر صاحب اور صحافی صاحب آپ لوگوں نے اس المیے کے بعد اپنے کردار میں کیا نمایاں تبدیلی پیدا کی ہے۔" اور مسٹر مشکور تم کیوں نیچی نگاہیں کئے بیٹھے ہو؟ بہت بڑھ چڑھ کر باتیں بنا رہے تھے، کچھ تو منہ سے پھوٹو"۔ اور جب ہم نے ان کے مسلسل اصرار کے باوجود کوئی جواب نہ دیا، تو انہوں نے ایکدم کھڑے ہوتے ہوئے کہا: "آپ لوگ تشریف لیجا سکتے ہیں، یہاں بلا وجہ بیٹھ کر میرا اور اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کے پاس فالتو وقت ہو، کم از کم میرا خیال کیجئے۔ اس المیے نے مجھے وقت کی قدر کرنا سکھایا ہے اور جو آدمی وقت کی قدر کرنا جانتا ہے وہ پھر پریشان نہیں ہوتا۔ خدا حافظ"

سفارشی جانور

ایک چڑا ایک چڑیا کے پاس آیا اور اپنی چونچ سے اُس کے کان میں کوئی بات کہی۔ چڑیا ایک دم ناراض ہو گئی۔ اُس نے پَر پھُلا کر اُس پر حملہ کر دیا۔ چڑا شرمندہ سا ہو کر اُڑ گیا اور چڑیا بہت دیر تک چُوں چُوں کرتی رہی۔ پرندوں کی زبان سمجھنے والے ایک ماہر کا کہنا ہے کہ چڑے نے چڑیا سے کسی دوسرے چڑے کے بارے میں سفارش کی تھی۔ جس پر چڑیا نے اُسے بے غیرت بے حیا اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ ڈالا۔ کہتے ہیں سفارش کرنا کچھ ایسا ہی بے غیرتی کا کام ہے۔

سفارشی جانور

خدا کا کرنا کیا ہُوا کہ ہمارا ایک دوست ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہوگیا۔ ظاہر ہے اِس حادثۂ عظیم پر ہمیں کس قدر خوشی ہوئی ہو گی ـــــ ہم یہ مژدہ جاں بخش سن کر اضطراری طور پر اچھلنے کودنے لگے۔ ہماری یہ اچھل کود حد سے بڑھنے لگی تو بیگم نے کہا۔ ”اے ہے! اب آرام سے بیٹھ بھی جایئے دوست ہی بڑا آدمی بنا ہے آپ تو بڑے آدمی نہیں بنے“ـــــ ہم نے بزرگوں سے اکثر سُنا تھا کہ عورت ذات نہایت تنگ نظر اور تنگ دل ہوتی ہے لیکن اس کا ابھی تک پوری طرح یقین نہیں آیا تھا۔ آج بیگم کی زبان سے یہ فقرہ سُنا تو اسلاف کے قول کی مکمل تصدیق ہوتی نظر آئی ہم بل کر کہا۔ ”ارے بیگم! کیا ہم میں اور ہمارے دوست میں کوئی فرق سمجھتی ہو، دوست کا بڑا آدمی بننا گویا ایسا ہے جیسے ہم خود بڑے آدمی بن گئے“۔

اِدھر سب دوستوں کی توقع کے خلاف ہمارے اسی دوست کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی وہ ہم سے اسی انداز میں ملتا ملاتا، تکبر تو اس میں نام کو پیدا نہ ہُوا۔ اپنے پرائے سب اس کے اخلاق کی تعریف کرتے۔ ہمیں بھی اس تعریف سے کچھ عجیب قسم کی مسرت کا احساس ہوتا تھا۔

ہمارے دوست کو کرسی سنبھالے ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ ایک شام ہمیں ایک جلسے میں شرکت کرنے کا اتفاق ہُوا ـــ جلسے کی کاروائی کافی دیر سے شروع ہو چکی تھی۔ ہم جلسے میں پہنچے تو اُس وقت ہمارا یہ دوست اپنا صدارتی خطبہ ارشاد فرما رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے اپنے چہرے کے ساتھ اپنی تقریر کا رُخ بھی ہماری طرف موڑ دیا یعنی ہمارے اس دوست نے بہ بانگِ دہل اعلان کیا۔ ”حضرات ایہ

صاحب جو ابھی ابھی جلسے میں تشریف لائے ہیں میرے نہایت عزیز دوست ہیں"۔۔ بس جناب پھر کیا تھا
ان الفاظ کے ساتھ ہی اہلِ جلسہ کے رُخ بھی ہماری طرف مُڑ گئے۔ سب کے سب حیرت سے دیکھنے لگے
اس وقت ہمیں یوں لگا جیسے ہم چشم زدن میں بڑے آدمی بن گئے ہیں۔۔ لمحہ بھر کے لئے اپنی خوش قسمتی پر
رشک آیا اور پھر آتا چلا گیا۔ جلسہ ختم ہوا تو ہمارے دوست نے بڑی بے تکلفی سے ہمارے کاندھے پر ہاتھ رکھ
کر مزاج پرسی کی۔ اس مشفقانہ حرکت پر بھی دیکھنے والے ورطۂ حیرت میں جائے بغیر نہ رہ سکے۔ ہمارے
اس دوست نے مزید یہ جسارت کی کہ چلتے وقت ہمیں اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھالیا۔ گھر واپس آئے تو
حقیقت یہ ہے کہ ہم خود بھی اپنے آپ کو خاصی بلندی پر محسوس کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم کوئی
لطیف شے بن کر فضائے کائنات میں تیرنے لگے ہیں لیکن ان تمام بلندیوں اور لطافتوں کے باوصف ایک
انوکھا احساس یہ ہو رہا تھا کہ ہماری پشت پر کوئی چیز اُگ آئی ہے اور ہم جس قدر فضا میں بلند ہوتے جاتے
ہیں اسی قدر یہ چیز بھی پھولتی پھلتی جا رہی ہے۔ ہم نے گردن موڑ کر دیکھا تو بے اختیار زبان سے نکلا۔
"ارے یہ تو ہمارے دُم نکل آئی ہے"۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ دُم دیکھ کر ہم پژمردہ ہو جاتے لیکن ہمارے
احساس کی کیفیت بالکل اس کے برعکس نکلی۔ ہم اپنی دم دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ ماشاء اللہ کیسی خوبصورت
دُم ہے۔ خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے ہم بھی دُم والے ہو گئے۔ اس رات تمام وقت کچھ اس طرح کے خواب
آتے رہے۔ ہماری دُم فضا میں لہرا رہی ہے اور ہم اسے دیکھ کر باغ باغ ہوئے جا رہے ہیں۔ ابھی اچھی
طرح صبح نہیں ہوئی تھی ہم عالمِ خواب کی لطافتوں کے آخری مزے لوٹ رہے تھے کہ کسی نے دروازہ
کھٹکھٹایا۔ گھر والوں کو پریشانی ہوئی کہ خدا خیر کرے اتنے سویرے کون آیا ہے۔ ہمیں جگا کر بیگم نے بتایا
کہ اجنبی سے کوئی صاحب آئے ہیں۔ صورت شکل سے مولوی معلوم ہوتے ہیں۔۔ "مولوی" ہم ہڑبڑا
کر اُٹھ بیٹھے۔ آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکلے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ دل ہی دل میں
اپنے حافظے پر لعنت بھیجی اور بیٹھک کا دروازہ کھول کر انہیں تشریف رکھنے کے لئے کہا۔ وہ ہمارے
سامنے بیٹھ گئے۔ ہم نے بجلی روشن کی۔ اپنی آنکھوں کو دوبارہ مَلا، ذہن پر زور دیا لیکن پہچاننے میں
کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے اُن سے صاف صاف کہہ ڈالا "معاف کیجئے

میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔" اُن صاحب نے اپنا تعارف کرایا تو معلوم ہوا دو سال کا عرصہ گزرا ملتان جاتے وقت وہ ریل میں میرے ہم سفر تھے۔ مجھے ایک دفعہ تو بڑا غصہ آیا کہ محض اتنی سی جان پہچان پر ان صاحب نے منہ اندھیرے میرے تمام گھر کو پریشان کرنے کی جُرأت کیسے کی؟ پھر خیال آیا معلوم نہیں بے چارا کون سی مصیبت میں گرفتار ہے۔ آنے کی وجہ معلوم کرنی چاہی۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ حضرت اپنے فرزندِ ارجمند کو جس نے تیسرے درجے میں امتحان پاس کیا ہے' ایک کالج میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "لیکن جناب میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں"

"وہ کیسے؟"

"میں کل شام اُس جلسے میں موجود تھا جہاں آپ کے محترم دوست صدارت فرما رہے تھے اگر وہ اشارہ بھی کر دیں تو میرے بیٹے کی زندگی سنور سکتی ہے"۔۔۔

لیکن آپ کے بیٹے نے اچھے نمبر کیوں حاصل نہیں کئے۔ میں اُن سے یہ سوال کرنے ہی والا تھا کہ مجھے احساس ہوا جیسے ایک تو میرا سوال بے محل ہے دوسرے کوئی میری دُم کھینچ رہا ہے۔ بغور دیکھنے پر پتہ چلا کہ ان آنے والے صاحب ہی نے میری دُم کا ایک بال پکڑ رکھا ہے اور وہ اُسے مسلسل کھینچے چلے جا رہے ہیں۔۔۔

"بھائی مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ میری دُم تو چھوڑ دیجئے"۔

"صاحب! آپ کی دُم سے میری زندگی وابستہ ہے۔ خدارا مجھ پر رحم کھایئے اور میری مدد کیجئے"۔

میں پہلے تو نرمی کے ساتھ انکار کرتا رہا لیکن جب ذرا ترش روئی اختیار کی تو اس شخص نے نفرت کے ساتھ میری دُم چھوڑتے ہوئے کہا۔ "بھائی صاحب! آپ کو معلوم ہونا چاہیئے آپ کی خود کوئی حیثیت نہیں یہ آپ کی دُم ہی کا کرشمہ تھا کہ مجھے منہ اندھیرے آپ کے پاس کشاں کشاں لے آیا" پھر ذرا رک کر کہنے لگا" آپ کو اس وقت اپنی دُم کے ایک بال کے کھینچنے پر اتنی تکلیف ہو

رہی ہے، کل شام جلسے میں اکثر لوگ آپ کی دم کھینچ رہے تھے اُس وقت تو آپ نے کوئی شکایت نہیں کی ــــ

"کیا کل شام جلسے میں میرے دُم نکل آئی تھی" میں نے حیرت سے پوچھا

"جی ہاں ــ جیسے ہی آپ کے دوست نے آپ کے ساتھ اپنی دوستی کا اظہار کیا سب نے اپنی گنہگار آنکھوں سے دیکھا کہ فوراً آپ کے ایک نہایت شاندار دُم برآمد ہو رہی ہے۔ اہلِ جلسہ میں سے اکثر نے اُسی وقت آپ کی دُم کھینچنا بھی شروع کر دی تھی ــــ لیکن غالباً آپ نے فرطِ انبساط میں اُس کھچاؤ کو محسوس نہیں کیا"ــــ

جب اُن صاحب نے دیکھا کہ میں اُن کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہوں تو انھوں نے میری دُم کا ایک بال پھر مضبوطی سے پکڑ لیا ــــ میں نے دوبارہ چھڑانے کی کوشش کی تو اس مرتبہ میرا بال بھی ٹوٹ گیا اور وہ صاحب بھی دھڑام سے زمین پر گر پڑے ــــ بہر حال میری دُم کھینچنے کے ضمن میں یہ صاحب بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئے۔ اِس کے بعد دُم کھینچنے کا وہ سلسلہ شروع ہوا کہ تو بہ ہی بھلی ــــ جو صاحب بھی تشریف لاتے وہ فوراً اس خاکسار کی دُم پکڑتے اور اُسے کھینچنے میں مصروف ہو جاتے۔ یہ اسی کھینچا تانی کا نتیجہ ہے کہ آج وہی گچھے دار دُم جو کبھی نہایت شاندار اور رُعب والی ہوا کرتی تھی گنجی ہو کر ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ ممکن ہے کہ مجھ پر یہاں یہ اعتراض کیا جائے کہ "صاحب آپ بھی عجیب قسم کے جانور ہیں لوگوں نے آپ کی دُم کھینچ کھینچ کر گنجی کر دی اور آپ ٹس سے مس نہ ہوئے، آپ کو چاہیئے کہ جیسے ہی کوئی آپ کی دُم کھینچتا فوراً اُس کے ایک دولتی رسید کرتے" ــــ اِس کے جواب میں میری گذارش یہ ہے کہ میں نے سفارشی ٹٹو ہونے کا عہدۂ جلیلہ ضرور سنبھالا لیکن اس کے باوجود میں کچھ نہ کچھ لکھتا پڑھتا بھی رہتا ہوں۔

تعلیم کے اور ہزاروں فائدے ہوں گے لیکن اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تعلیم یافتہ انسان میں کسی کے دولتی جھاڑنے کی سکت باقی نہیں رہتی۔ (غالباً اسی وجہ سے ہمارے کچھ بزرگ اعلیٰ تعلیم کو عام کرنے کے حق میں نہیں) دولتی جھاڑنا تو ایک طرف رہا میرے ساتھ تو یہ ہو رہا ہے کہ لوگ

میری دُم بھی کھینچتے ہیں، کام بھی نکلوانتے ہیں اور جب کام بن جاتا ہے تو چلتے وقت اُلٹے خود میرے ایک دولتی بھی مار جاتے ہیں۔ جب تک کام نہیں بنتا میری گردن پر سوار رہتے ہیں اور میں انہیں ایک نہایت سلیم الطبع لادو جانور کی حیثیت سے اٹھائے اٹھائے پھرتا ہوں۔

دُم نکلنے سے پہلے میں سفارش کا بے حد قائل تھا۔ سوچتا تھا آخر کسی کے کام آنے میں کیا مضائقہ ہے۔ سفارش کے معنی ہیں تعارف۔ گویا جب کسی کی سفارش کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سفارش کرنے والا متعلقہ شخص اور اس کے متعلقہ کام سے واقف ہے۔ اس طرح سفارش کر کے ہم سرخ فیتہ کی جان لیوا تاخیر سے نجات حاصل کر لیتے ہیں اور کام جلدی انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ لیکن دُم تو میرے لئے بے اندازہ تجربات کا سرچشمہ ثابت ہوئی۔ پتہ چلا کہ سفارش محض تعارف نہیں بلکہ معرفتِ زمانہ حاصل کرنے کا ایک سخت اور طویل ذریعہ ہے۔

سفارش کرنے والے کو پہلا عرفان اس مشہور کہاوت کا ہوتا ہے کہ نیکی کر دریا میں ڈال — کسی کی سفارش کر کے اگر آپ اِس بات کے خواہش مند ہیں کہ وہ آپ کا احسان مند بھی ہو تو آپ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ سفارش کے بعد کوئی آپ کا ممنون ہونے کو تیار نہیں —— اُس کا خیال ہوتا ہے کہ ایک تو اس کا کام جائز تھا دوسرے اس نے ایک اور دوست کو بھی سفارش کے لئے کہہ رکھا تھا۔ کام آپ کے کہنے پر نہیں ہوا بلکہ اس دوست کی وجہ سے ہوا ہے جس کا نام کبھی نہیں بتایا جاتا۔ احسان مند ہونا تو خیر بڑی بات ہے اگر آپ مطعون نہیں کئے جاتے اسی پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔

ایک دن میرے ایک عزیز منہ لٹکائے میرے پاس آئے۔ یہ فطرتاً شریف آدمی ہیں لیکن اُن سے اکثر و بیشتر ملنے ملانے کے سلسلے میں حماقتیں بھی سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ میں نے جب انہیں اس طرح افسردہ خاطر دیکھا تو اُن کی افسردگی کی وجہ پوچھی۔ فرمانے لگے "میرا تبادلہ ایک دور دراز علاقے میں کر دیا گیا ہے۔ میں وہاں جانے سے نہیں گھبراتا لیکن دُکھ اس بات کا ہے کہ جو افسر وہاں سے تبدیل ہو کر میری جگہ آیا ہے اس کا تبادلہ اس کی بد عنوانیوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ اچھا انصاف ہے کہ ایک بُرا اہل کار اچھی جگہ آ جائے اور جس کا کوئی قصور نہ ہو اُسے بُری جگہ بھیج دیا جائے۔

اُن کی بات نہایت معقول تھی - تبادلہ رُک گیا - لیکن چند روز بعد ہی اس عزیز کی بیوی نے شکایت
کی کہ تبادلہ رُک جانے سے بہت بڑا ظلم ہوا ہے - اگر تبادلہ ہو جاتا تو وہ اپنے ساس سسر سے دُور
رہ کر آرام کے دن گزارتی - خود میرا وہ عزیز بھی کہنے لگا کہ واقعی اگر میں وہاں چلا جاتا تو مجھے
فائدہ ہی رہتا - مطلب یہ ہے کہ نیکی کر دریا میں ڈال والی کہاوت کا تعلق نیکی برباد گناہ لازم والی
کہاوت سے بہت گہرا ہے - اور تعلق کی گہرائی کو ایک سفارش کرنے والا ہی جان سکتا ہے -
ویسے اپنا کام نکلوا کر بھی لوگ جب مطعون کرتے ہیں، بُرا بھلا کہتے ہیں تو میں اُن کے طعنے اور گالیاں
نہایت خاموشی کے ساتھ اس لئے سُن لیتا ہوں کہ آخر ہر انسان کی اپنی ایک اَنا اور عزتِ نفس
ہوتی ہے ــــ اگر ہمارے کام انصاف کی بنا پر خود بخود ہوتے چلے جائیں تو کسی کو سفارش کے
لئے کہیں جانے کی کیوں ضرورت پیش آئے ؟ ــــ یقین جانیے کسی کے پاس اپنا کوئی کام لے
کر جانا اتنی بڑی ذلّت ہے جس کو ضبطِ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا - چنانچہ جب آپ کا کوئی ملنے
والا آپ کے پاس سفارش کے واسطے آتا ہے اور آپ اس کا کام کرا بھی دیتے ہیں لیکن اس کے
باوجود وہ آپ سے ناخوش رہتا ہے آپ کو گالیاں دیتا ہے یا آپ کے احسان کو نہیں مانتا تو میں
اسے حق بجانب سمجھتا ہوں - خود ہی فرمائیے اس غریب کے پاس اپنی اَنا کو تسکین پہنچانے کا اس
انکار اور جلی کٹی باتوں کے علاوہ دوسرا کون سا ذریعہ ہے -

واضح رہے کہ میرے اس مضمون کا تعلق ان لوگوں سے ہرگز نہیں جو غلط کام کے لئے سفارش
لے کر آتے ہیں اور جو ان غلط سفارشوں کو لے کر آگے چلتے ہیں - اس قسم کی سفارشوں میں ایک تو کوئی
دشواری پیش نہیں آتی یعنی کام جلدی ہو جاتا ہے دوسرے جو لوگ ایسی ناجائز سفارشیں لے کر
آگے بڑھتے ہیں ان کو بری طرح ٹٹو بننے کی بھی زحمت گوارا فرمانے کی ضرورت نہیں ہوتی - اسی طرح
ایسے لوگ میری طرح دُم بھی نہیں لگاتے پھرتے ــــ اُن کے دُم ضرور اگتی ہے لیکن چونکہ وہ اس
کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے اس لئے یہ دُم اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتی - اور اگر کبھی تجاوز کرنے بھی
لگتی ہے تو یہ لوگ اپنی خود غرضیوں کی قینچی سے اُسے فوراً اڑا دیتے ہیں - بے شک دُم رکھنا ہمارے

زمانے کا فیشن بن گیا ہے لیکن اُسے ہر جگہ دکھاتے پھرنا حماقت سمجھا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ دُم دکھانے کی چیز نہیں ہوتی دبانے کی چیز ہوتی ہے - مجھ ایسے احمق اپنی دُم کا مظاہرہ کرتے ہیں اور سرِ بازار اُن کی دُم کھینچی جاتی ہے اور وہ رُسوا ہوتے ہیں - لیکن سوچنے کی بات ہے کیا دُم دبانے سے اس کا مظاہرہ کرنا زیادہ بہتر کام نہیں ہے - دُم دبی رہے تو ہمیشہ قائم رہتی ہے اس کا مظاہرہ ہو جائے تو ایک نہ ایک دن اسکے خاتمے کی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے - لیکن میرے اس نہایت معقول خیال پر میری بیوی کا کہنا ہے کہ مشکور تم کثیر الاحباب واقع ہوئے ہو اس لئے کبھی دُم سے نجات حاصل نہیں کر سکتے - دُم تمہارے ساتھ قبر تک جائے گی اور کیا عجب ہے کہ تمہارے مرنے تک یہ دُم اس قدر بڑھ جائے کہ قبر سے باہر بھی نکلی رہے - میں سمجھتا ہوں میری بیوی مجھے بہکا رہی ہے اور میرے دوستوں کے ساتھ لڑائی کرانا چاہتی ہے - آپ کس کے ہم خیال ہیں - میرے یا میری بیوی کے ؟ ———

آسان نُسخہ

پاکستان بننے سے پہلے میرے پاس ایک اِنچ زمین نہیں تھی اور اب اللہ کے فضل و کرم سے میں کئی سو ایکڑ اراضی کا مالک ہوں۔ میں آپ کو صحیح اعداد بھی بتا سکتا تھا، لیکن مصلحت کے طور پر ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ زمیندار ہونے کی ایک حد مقرر ہے اور میں اس حد سے کہیں زیادہ اراضی کا مالک ہوں۔ میں قانون کا احترام کرتا ہوں، اس لئے یہ نہیں چاہتا اگر میں اس پر عمل پیرا نہیں ہو سکا، تو قول سے بھی روگردانی کردوں۔ ویسے یقین کیجئے اگر مجبوری نہ ہوتی، تو میں عملاً بھی حد سے نہ گزرتا۔ لیکن آپ جانتے ہیں آج کل قدم آگے بڑھانے کا زمانہ ہے، اس طرح کی کوئی نہ کوئی حرکت بغیر ارادہ بھی سرزد ہو جاتی ہے۔

ممکن ہے آپ مجھ سے پوچھنا چاہیں کہ میں نے یہ جائداد کیسے حاصل کی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچ رہے ہوں کہ کس طرح پوچھا جائے؛ تو جناب اس میں شرمانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ صاحبِ جائداد بننے کا راز کوئی ایسا نہیں جسے پوچھنے یا بتانے میں کسی قسم کی جھجک محسوس ہو۔ یہ تو ایک کھلا ہوا راز ہے جسے ہر کوئی جانتا ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ ایک بات کو جانتے ہوئے بھی ہم اسے نہ جانیں۔ بہر حال میں چونکہ ایک صاف گو انسان ہوں، اس لئے بتانے میں ویسے بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا، بلکہ میں تو اسے کارِ خیر میں شمار کرتا ہوں۔ ایک عمل جس سے اپنی ذات کو فائدہ پہنچا ہے، اپنے دوستوں کو ضرور بتانا چاہیئے تاکہ سب اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

آپ جانتے ہیں ہر کام کے لئے محنت پہلی شرط ہے، چنانچہ صاحبِ جائداد بننے کے لئے بھی محنتی ہونا

ازبس ضروری ہے؛ البتہ یہاں محنت کا طریقِ کار ذرا مختلف ہے۔ آغاز میں چونکہ مجھے محنت کا یہ طریقہ معلوم نہ تھا اس لئے کچھ کامیابی حاصل نہ ہو سکی لیکن جیسے ہی یہ طریقہ معلوم ہوا چند دنوں میں میری قسمت بدل گئی۔ یہ سب کیونکر ہوا، آپ بھی سُن لیجئے:

مجھے ابتدا میں مہاجرین پر بڑا رشک آتا تھا، کیا حکومت، کیا عوام ہر کوئی ان سے ہمدردی کا اظہار کرتا۔ ذرا سی تگ و دو سے انہیں رہنے کو مکان اور کاشت کے لئے زمین مل جاتی۔ ہمارے محلے میں سردار بچن سنگھ اور رہبر بنس سنگھ کی دو بڑی بڑی حویلیاں تھیں، ان میں بہت سا مال و اسباب موجود تھا، ان حویلیوں اور ساز و سامان کو دیکھ کر میری طبیعت بہت للچائی، لیکن حکومت نے انہیں اپنے قبضے میں لے کر مقفل کر دیا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ان حویلیوں میں مہاجرین آ دھمکے ہیں۔ اس دن کے بعد سے مجھے مہاجرین سے رشک کے بجائے حسد ہونے لگا۔ میں سوچتا تھا ٹھیک ہے ان لوگوں نے قربانیاں دی ہیں، یہ برباد ہوئے ہیں، لیکن ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی جائداد میں آخر کچھ ہمارا حصّہ بھی تو ہونا چاہیئے۔ تھوڑی ہی مدت بعد جب مجھے پتہ چلا بعض مہاجرین جھوٹے اور غلط کلیم بھر کر مکان اور زمین حاصل کر رہے ہیں پھر تو میرے حسد کی کوئی انتہا نہ رہی۔

میں دس جماعت پاس تھا۔ اپنے ایک عزیز کی وساطت سے مجھے ایک سرکاری ملازمت مل گئی، اس ملازمت میں اگرچہ کچھ عرصہ تو میں بے وقوفوں کی طرح رہا، لیکن چونکہ اللہ میاں نے ذہانت کا وافر حصّہ عطا فرمایا ہے، اس لئے جلد ہی میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ویسے حقیقت یہ ہے اگر میں یہ ملازمت اختیار نہ کرتا، تو شاید نہ اس مقام پر پہنچتا اور نہ مجھے بہت سی حقیقتوں کا پتہ چلتا۔ پہلی بات اس ملازمت میں اگر یہ معلوم ہوئی کہ مہاجرین نے اتنے غلط کلیم نہیں دیئے جتنا انہیں بدنام کیا گیا، بلکہ سچ پوچھئے تو معاملہ اس کے برعکس تھا، یعنی ایسے مہاجرین کی تعداد کچھ کم نہیں جنہیں ان کا حق نہ مل سکا۔ دوسری بات جو مجھے معلوم ہوئی، وہ یہ تھی کہ جائداد حاصل کرنے کے لئے حقدار ہونے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی سفارش دار اور حصّہ دار ہونے کی ضرورت ہے۔ سفارش دار کا مطلب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے، حصّہ دار کا مطلب آپ کو خود بخود سمجھ میں آ جائے گا۔

مہاجرین اپنا حق حاصل کیوں نہ کر سکے ؟ میرے خیال میں اس کی ذمہ داری نہ حکومت پر ہے نہ عوام پر ـــ اس کے تمام تر ذمہ دار خود مہاجرین ہیں۔ آخر حق حاصل کرنے کے لئے محنت کرنا پڑتی ہے انہوں نے محنت کیوں نہیں کی۔ دربدر مارے مارے پھرتے رہے' اپنے مرنے والوں کو یاد کرکے روتے رہے۔ اپنی چھوڑی ہوئی زمینوں اور جائدادوں کا نوحہ پڑھتے رہے اور عمل کچھ نہ کیا۔ بہت سے مہاجرین تو اتنے سست اور کاہل تھے کہ انہوں نے کلیم تک داخل نہ کئے' بیٹھے بٹھائے انہیں کون زمین اور مکان الاٹ کر دیتا۔ انہیں چاہیئے تھا دربدر پھرنے کے بجائے دفتروں کا طواف کرتے یا دفتروں کے سامنے ہی دھونی رما لیتے۔ سفارش دار بنتے اور اگر سفارش کوئی نہ تھی' تو سیدھا سادا عمل یہ تھا کہ حصہ دار بن جاتے جن مہاجرین نے ایسا کیا آخر اُن کو سب کچھ مل ہی گیا' بلکہ وہ کچھ بھی مل گیا جس کے وہ مستحق نہ تھے۔ محنت بہر حال لازم ہے' چنانچہ جو مہاجرین اپنے حق کی زمین یا مکان الاٹ نہیں کرا سکے' مجھے اُن سے کوئی ہمدردی نہیں۔ حق حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کی کوشش لازمی ہے۔

ایک اور صورت بھی ہے۔ بہت سے مہاجرین اپنا حق فروخت کر دیتے ہیں جسے عُرفِ عام میں یونٹ بیچنا کہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ لوگ پھر بھی سمجھداری کا ثبوت دیتے ہیں۔ انہیں کچھ رقم بھی مل جاتی ہے اور مجھ ایسا سفارش دار یا حصہ دار صاحبِ جائداد بھی بن جاتا ہے۔ ہمارے دفتر میں ایک دفعہ ایک ایسے صاحب تعینات ہو گئے جو یونٹ کے کاروبار کو بُرا سمجھتے تھے' وہ کہتے تھے کہ یہ کام ناجائز اور غریب مہاجرین کا حق تلف کرنے کے مترادف ہے۔ ان کا خیال تھا یونٹ خریدے جاتے ہیں پانچ ہزار کے اور ان پر زمین الاٹ کرائی جاتی ہے پانچ لاکھ کی ـــــ یہ بے انصافی اور ظلم نہیں' تو اور کیا ہے ؟ جب تک یہ تعینات رہے' سفارش داروں اور حصہ داروں کو خاصی تکلیف رہی۔ یہ صاحب خاصے بیوقوف آدمی تھے۔ انہوں نے نہ اپنے عزیزوں کے نام زمین الاٹ کرائی تھی نہ کسی سینما یا فیکٹری وغیرہ میں ان کا حصہ تھا' حالانکہ ان سے پہلے اور بعد میں جتنے افسر آئے' ماشاء اللہ سبھی صاحبِ جائداد بنے۔

ایک دن ایک صاحب نے مجھے رازدار بناتے ہوئے کہا :" مسٹر کس دنیا میں رہتے ہو' ہماری خدمت بھی کرو اور خود بھی کچھ بن جاؤ "۔ ان دو مختصر جملوں نے میری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ خدا موقت

کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور مجھے اُمید ہے کہ ضرور ایسا ہی ہو گا کیونکہ جو کچھ تکلیف پہنچا تی وہ موت کو مرنے سے قبل ہی پہنچ چکی تھی بے چارے تڑپ تڑپ کر مرے ان کے جسم میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ بہر حال ایسی تکلیفیں بھی نیک اور اچھے آدمیوں کو ہوا کرتی ہیں۔ جب اُن کا ذکر آ ہی گیا ہے تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں ان کی کون کون سی خوبیاں بیان کروں۔ لکھ پتی بلکہ کروڑ پتی ہونے کے باوجود طبیعت میں انکسار اس قدر کہ ایک رات ایک نالائق انسان ان کی کار کے نیچے آ کر مر گیا۔ موصوف نے فوراً اسے اپنی کار میں ڈالا اور خود کفن دفن کا انتظام کیا۔ کہنے لگے۔

"چونکہ اس نے ہماری گاڑی کے نیچے آ کر دم توڑا ہے اس لئے اب یہ ہمارا مال ہے اس کے وارثوں کو تلاش کرنا فضول ہے۔ ہم سے بڑھ کر اس کا وارث کون ہو سکتا ہے"۔

جس جس شہر میں موصوف تعینات ہوئے وہاں ان کی شہری زمین موجود تھی۔ ایک دن موج میں آ کر بتانے لگے "برخوردار کیا پوچھتے ہو اس وقت پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں خاکسار کی کم از کم اسّی ہزار ایکڑ زمین موجود ہے۔ اگر کم از کم فی مرلہ دو ہزار روپے بھی لگاؤ تو دیکھ لو کتنی رقم بنتی ہے"۔

میں نے عرض کیا "سرکار کروڑ پتی تو اس جائداد سے بن گئے"۔

فرمایا "برخوردار یہ تو کچھ بھی نہیں اسے مشتے از خروارے سمجھو فیکٹریوں سینماؤں اور زرعی زمین کی جائداد الگ ہے"۔

میں نے کہا "لیکن جناب خدا بُرا وقت نہ لائے اگر کبھی پکڑے گئے تب کیا بنے گا"۔

قہقہہ لگا کر بولے "واہ بھئی واہ تم تو نرے کاٹھ کے اُلّو ہو ہمیں کون پکڑ سکتا ہے ہم قانون کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ہم نے یہ جائداد اپنے یا اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے نام کب لگوائی ہے ہزار کوشش کے باوجود ہم کسی کی گرفت میں نہیں آ سکتے پکڑنا تو در کنار کوئی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا"۔ پھر کہنے لگے "اگر یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ ہمارے نام کتنی جائداد ہے تو میاں ہم بہت غریب آدمی ہیں خود سوچو ملازمت میں رہ کر کوئی شخص صاحب جائداد بن سکتا ہے تنخواہ میں تو گزارا مشکل سے ہوتا ہے۔

اس دن میں نے دیکھا کہ صاحب کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک ہے جس سے مجھے خواہ مخواہ

خوف آرہا تھا۔

خدا ان صاحب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ایک دن مجھ سے دفتر میں بڑے مشفقانہ انداز میں کہنے لگے "تم ڈیڑھ دو ہزار زرعی یونٹ کیوں نہیں خرید لیتے؟"

میں نے جواب دیا "اس کے لیئے خاصی رقم درکار ہوگی اور میرے پاس معمولی سی رقم ہے"۔

پوچھا "کتنی رقم ہے"؟

میں نے کہا "مشکل سے تین ہزار"۔

فرمایا "باقی رقم کا میں انتظام کر دیتا ہوں"۔

چھ ہزار میں یونٹ خرید لئے گئے۔ میں نے کہا "جناب والا، زمین کہاں سے آئے گی اور کیونکر الاٹ ہوگی"۔

بولے "اس کی فکر نہ کرو، یہ بتاؤ کہاں زمین چاہتے ہو"۔

عرض کیا "شہر کے آس پاس"۔

"بنسی پور ٹھیک رہے گا؟"

"نہایت مناسب، لیکن جناب سُنا ہے وہاں تو ایک پروفیسر صاحب کے یونٹ پہلے سے پڑے ہیں، حق تو ان کا بنتا ہے"۔

"پھر وہی بے وقوفوں والی باتیں کرتے ہو، حق کیا ہوتا ہے، ہم وہ یونٹ وہاں سے اٹھوا دیں گے"۔

"اِن پروفیسر صاحب کی سفارش بھی ہے"۔

"حصہ داری کے سامنے سفارش داری کوئی معنی نہیں رکھتی"۔

"میں سمجھا نہیں جناب"۔

"وقت آنے پر سب کچھ سمجھ میں آجائے گا"۔ ذرا ٹھہر کر بولے "اگر یہ پروفیسر ذرا بھی سمجھدار آدمی ہوتا تو ہمارے ساتھ حصہ دار بن جاتا۔ ہم اسے کبھی کا زمیندار بنا دیتے، مگر وہ تو بالکل پاگل ثابت ہوا۔ ہمارے پاس آکر باتیں بنا کر چلا جاتا ہے اور کام کی کوئی بات نہیں کرتا۔ ایسی حالت میں ہم اُس کے حق

کو کیا دیکھیں"۔

"لیکن حضورِ والا، پروفیسر صاحب کے تو اپنے یونٹ ہیں، انہوں نے خریدے تو نہیں"۔ صاحب نے میری بات بالکل نہیں سُنی۔

میں پھر کہوں گا کہ خدا ان مرحوم صاحب کو غریقِ رحمت کرے، مجھے چھ ہزار میں سات آٹھ مربع زمین الاٹ کرادی۔ یہ زمین مال کے کاغذات میں بنجر لکھ رکھی تھی، اسی لئے دس گیارہ یونٹ میں ایک ایکڑ اراضی کے حساب سے الاٹ منٹ ہوئی اور پھر قصور کی بنا پر ۴۰ فی صد کا اضافہ الگ ملا۔ جب زمین الاٹ ہو گئی، تو میں نے کہا "جناب، آپ کے تین ہزار روپے مجھے دینا ہیں، میں انشاء اللہ جلد ادا کردوں گا"۔

صاحب نے جواب دیا "یہ رقم تم سے واپس لینے کے لئے نہیں دی گئی تھی، یوں کرو، اپنی اس اراضی میں سے نصف اراضی مِس طناز کے نام کرادو، وہ بہت اچھی فنکار ہے، تم جانتے ہو وہ ہماری پسند ہے، اس کی خدمت کر کے ہمیں بھی خوشی ہوگی اور تم بھی فخر کرو گے"۔

میں نے سوچا اب بھی گھاٹے کا سودا نہیں ہے، چنانچہ صاحب کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ ان مربعوں میں سے اس وقت میرے پاس چار مربع ہیں اور ہر مربع کی قیمت ایک لاکھ روپے ہے۔ گویا تین ہزار میں چار لاکھ کمائے۔ اس الاٹمنٹ کے بعد میں نے زمین جائداد بنانے کا خود کاروبار شروع کر دیا۔ جب کاروبار خوب چل پڑا، تو ملازمت کو خیرباد کہا۔ جس پروفیسر کی جگہ مجھے پہلی بار زمین الاٹ ہوئی تھی، وہ آج تک اپنی بیوقوفیوں کی وجہ سے دھکے کھاتا پھرتا ہے اور میں نے جیسا کہ شروع میں عرض کر چکا ہوں سینکڑوں ایکڑ اراضی الاٹ کرالی —— صاحبِ جائداد بننے کا سیدھا سادا نسخہ یہ ہے کہ آؤ نے پونے یونٹ خریدو، خواہ یہ یونٹ جعلی کیوں نہ ہوں، حصہ دار بنو، یعنی زمین الاٹ ہو جائے، تو آدھی خود رکھو، آدھی الاٹ کرانے والے کو دو اور زمیندار بن جاؤ۔ اس نسخے پر عمل کر کے میں نے خود بھی بہت سی جائداد جمع کی ہے اور بہت سے دوستوں کو بھی صاحبانِ جائداد بنا ڈالا ہے۔

آج کل میرے پاس رہنے کے لئے عالی شان بنگلے ہیں، سیر کرنے کے لئے ایک نہیں دو دو

گاڑیاں ہیں، جس جگہ جاتا ہوں میری عزت ہوتی ہے' میرے اکثر شہر دار مجھے اپنا لیڈر مانتے ہیں' ہر قسم کا مشورہ مجھ سے لینے آتے ہیں' ایک دو پڑھے لکھے مجھ سے جلتے ہیں' میں انہیں بہانگِ دہل کہا کرتا ہوں "آؤ' اگر تم میں زور ہے' تو مجھے پکڑ کر دکھاؤ' خالی چیخ پکار اور ہڑ بازی کرنے سے کیا ہوتا ہے"!
میرے اس اعلان پر وہ مجھے دل ہی دل میں گالیاں دے کر رہ جاتے ہیں۔ میں انہیں پھر کہتا ہوں:
"تم مجھے نہیں پکڑ سکتے' اکثریت میری طرف ہے' قوم میری طرف ہے' لوگ روپے کی عزت کرتے ہیں' جب تک دولت کی اس طرح پرستش ہوتی رہے گی' اس وقت تک کوئی میرا بال بیکا نہیں کر سکتا اور یاد رکھو ہمیشہ اسی طرح ہوتا رہے گا اور میں ہمیشہ کامیاب ہوتا رہوں گا، زیادہ ہی کوئی خطرے کی بات نظر آئی' تو سیاست میں آجاؤں گا' لوگ اسے خارزار کہتے ہیں' میں سمجھتا ہوں یہ بھی اہل سیاست کی چال ہے، دُنیا کو لوٹ کر سیاست دان بن جاؤ، سارے عیبوں پر پردے پڑ جائیں گے ـــــ صاحبِ جائداد ہونے کی اسے معراج سمجھیے' اب میرا بھی یہی پروگرام ہے۔ انشاء اللہ۔

بادشاہت زندہ باد

کہتے ہیں ایک دفعہ کسی شہرِ عظیم میں ایک قلندر نے بڑی سڑک کے عین درمیان کھڑے ہو کر چلانا شروع کر دیا :

"لوگو، اے آنکھیں بند کر کے تیزی سے چلنے والے لوگو! ذرا ٹھہرو اور میری بات سُنتے جاؤ۔"

پہلے تو راہگیروں نے اس کی چیخ پکار پر کوئی توجہ نہ دی، لیکن جب دیکھا کہ یہ بیوقوف درویش عین سڑک کے درمیان کھڑا ہے اور خواہ مخواہ مرنا چاہتا ہے، تو انہوں نے اپنی صاف و شفاف پیشانیوں پر بل ڈالتے ہوئے اپنی چمکدار گاڑیوں کو بریک لگانے شروع کر دیئے۔ بریکوں کی چیخوں سے فضا میں خوف کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کچھ گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا بھی گئیں۔ وہ قلندر ابھی درمیان ہی میں کھڑا تھا اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ایک لمبی سی گاڑی میں سٹیئرنگ پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے اپنی گردن کو ذرا جھٹکا دیا اور برابر بیٹھے ہوئے ساتھی سے کہا :

"کیا بکواس ہے، وہ ہمارا انتظار کر رہی ہو گی اور ہم یہاں بلاوجہ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں گاڑی چلاتا ہوں اگر یہ ایڈیٹ مرتا ہے، تو مر جائے۔ اس کے نہ ہونے سے دنیا کی رونق میں کون سا فرق آ جائے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ گاڑی اس مردِ فقیر کو کچلنے ہی والی تھی کہ اچانک ایک جھٹکے سے خود بخود رُک گئی۔ اس نوجوان نے دیکھا کہ فقیر کا قد بلند ہو رہا ہے —— وہ خوفزدہ ہو کر اپنی جگہ بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ اتنے میں کچھ اور لوگ بھی اپنی اپنی گاڑیوں سے اتر کر اس

فقیر کے گرد جمع ہو گئے، فقیر کہہ رہا تھا:

"اے لوگو، میری بات غور سے سنو۔ ملنساری سب سے بڑا اخلاق ہے۔ بادشاہت سب سے بڑی بداخلاقی"۔

درویش کی زبان سے یہ فقرہ نکلا ہی تھا کہ کار میں بیٹھے ہوئے نوجوان کی حالت معمول پر آگئی۔ اُس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا، تو وہ درویش بھی اُسے عام انسانوں کی طرح دکھائی دیا۔ اُس نے درویش سے کہا:

"بابا، ملنساری کی بات تو سمجھ میں آگئی، لیکن بادشاہت سے یہاں تیرا کیا مطلب ہے؟"

"میرے عزیز، تم ملنساری کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ تمہیں اگر ملنساری کے معنی معلوم ہوتے تو تم یہ بھی سمجھ جاتے کہ یہاں بادشاہت سے میری مراد کیا ہے"۔ درویش نے جواب دیا۔

ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں:

"ہم کچھ نہیں سمجھے ـــــ ہم کچھ نہیں سمجھے"۔

درویش نے بلند آواز سے کہا:

"تم ٹھیک کہتے ہو ـــــ ٹھیک کہتے ہو ـــــ میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ سنو، ملنساری کے معنی محض آپس میں ملنا جلنا نہیں ہے۔ ملنساری کے معنی ہیں اپنے علاوہ دوسرے انسانوں کو بھی انسان سمجھنا"۔

ایک طرف سے آواز آئی:

"اے مردِ فقیر، یہ تو نے کون سی انوکھی بات کہی ہے۔ انسانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، ایک گھوڑا بھی دوسرے گھوڑے کو گھوڑا ہی سمجھتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی، تو وہ گھوڑی کو دیکھ کر کبھی نہ ہنہناتا"۔

فقیر نے آواز کی طرف رُخ کیے بغیر جواب دیا:

"بات کہنے والا ذہین معلوم ہوتا ہے، لیکن وہ اپنی ذہانت کا ٹھیک استعمال نہیں کر رہا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ دوسرے انسانوں کو اپنے جیسا انسان سمجھنا ملنساری ہے، تو اس سے ہمارا یہ مطلب ہوتا

ہے کہ ہم جس طرح اپنی خواہشات اور آرزوؤں کا احترام کرتے ہیں، اسی طرح دوسروں کی خواہشات اور آرزوؤں کا بھی احترام کریں۔ گھوڑا گھوڑی کو دیکھ کر ہنہناتا ضرور ہے، لیکن وہ گھوڑی کی کمر پر رکھے ہوئے بوجھ کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر نہیں رکھ سکتا۔ اگر ایک انسان دوسرے انسان کو دیکھ کر "ہنہناتا" ہے تو اسے یہ قدرت بھی حاصل ہے کہ وہ دوسرے انسان کا بوجھ ہلکا کرے، اس کے دُکھ سکھ میں کام آئے، بالکل اس طرح جیسے وہ خود اپنے کام آتا ہے۔"

سڑک کے ایک کنارے سے کوئی بولا:

"آخر اس سے فائدہ؟ جتنی دیر آدمی کسی کے کام آئے، اُتنے عرصے وہ اپنے کام کیوں نہ آئے؟"

قلندر نے جواب دیا:

"یہ بہت پرانی بات ہے اور آدمی اسے دُہرا دُہرا کر پاگل ہوا جا رہا ہے —— وہ اپنے آپ کو صرف اپنے تک محدود رکھنے میں عافیت سمجھتا ہے، حالانکہ اس میں نہ خود اس کی عافیت ہے نہ کسی اور کی —— اپنی ذات کے خول سے باہر نکلنے میں بظاہر بے حد خوف معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر اس خوف پر قابو پا لیا جائے، تو ذات کی وسعت میں بے پایانی آجاتی ہے۔"

ایک طرف سے آواز آئی:

"سارا مسئلہ ظاہر کا پردہ چاک کرنے کا ہے۔"

فقیر نے کہا:

"ظاہر کا پردہ تنہا بیٹھ کر چاک نہیں کیا جا سکتا۔ تنہائی، باطن کے جلوے تو دکھا سکتی ہے، ظاہر کے پردے نہیں اُٹھا سکتی —— اور یہ سب کو معلوم ہے کہ ظاہر کے پردے نہ اٹھیں، تو باطن کے جلوے بھی محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ تلاشِ حقیقت کا یہ سب سے کٹھن مرحلہ ہے۔ ملنساری انسان کو اسی کٹھن مرحلے سے بخیر و خوبی گزارنے کے اسباب مہیا کرتی ہے۔"

ایک آواز پھر مخل ہوئی:

"بادشاہت کا اخلاق سے کیا تعلق ہے اور آپ نے اسے سب سے بڑی بداخلاقی کیسے کہہ دیا؟"

درویش جواب میں بولا:

"ایسا معلوم ہوتا ہے مجھے ملنساری سے پہلے بادشاہت کے بارے میں کچھ بتانا چاہیئے تھا بہر حال اس حقیقت سے تو سبھی واقف ہیں کہ مل جل کر زندگی بسر کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے، چنانچہ یہ اس کی ایک مجبوری ہے ——— اس مجبوری سے کس طرح نمٹا جائے؟ اسی سوال کو عرفِ عام میں اخلاق کہا جاتا ہے ملنساری مسئلہ اخلاق کا حل ہے۔ بادشاہت اس راستے میں دیوار ——— ہر آدمی بادشاہ ہے، کیونکہ ہر آدمی جانور ہے۔ آدمی جانور نہ ہوتا، تو بادشاہ بھی نہ ہوتا ——— 'سب کچھ میری مرضی کے مطابق ہو ——— میں جو چاہوں، سو کروں' ——— یقین کیجئے، یہ آواز انسان کی نہیں جانور کی ہے۔ اگر جو چاہنا سو کرنا ہی کوئی معیار ہے، تو بلاشبہ اس معیار پر انسان کی نسبت دوسرے جاندار زیادہ پورے اترتے ہیں۔ جانوروں میں شیر کو جنگل کا بادشاہ کہا جاتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں انسان کے ظلم و ستم سہنے کے باوجود گدھا بھی اپنی جگہ کم بادشاہ نہیں ہے ——— اگر یہ والا جناب اپنی موج میں ہیں (اور اکثر یہ اپنی موج میں رہتے ہیں) تو کمہار کی کیا مجال ہے کہ انہیں ان کی موج سے نکال سکے۔ گدھے کی طرح آدمی بھی اپنی موج میں رہنے کا بہت خواہشمند ہوتا ہے۔ وہ اپنی یہ خواہش فلسفہ و حکمت میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے۔ اس کے لئے طرح طرح کی اصطلاحیں تراشتا ہے۔ 'نارمل آدمی وہ ہے جو اپنی خواہشات کا احترام کرے۔ ابنارمل وہ ہے جو ان خواہشات کو لگام دے' ——— آپ نے دیکھا آدمی اپنے مطلب کے لئے حقائق کی صورت کس طرح بگاڑتا ہے!"

قریب کی گاڑی میں بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر کے ایک آدمی نے جمائی لیتے ہوئے کہا:

"لیکن بابا، اپنی سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا کہ بادشاہت سب سے بڑی بداخلاقی کیسے ہوئی؟"

درویش نے ذرا رک کر کہا:

"اچھا، تو پھر اس طرح سمجھ ——— من مانی کرنا بادشاہت ہے۔ بظاہر تو من مانی کرنے کے تصور میں بڑی کشش نظر آتی ہے، لیکن اگر انسان من مانی کرتا رہے، تو وہ اپنے ہم جنسوں کے زمرے سے کٹ کر زرے حیوانوں کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ اس طرح

طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ انا صرف انسان ہی میں نہیں ہوتی، دوسرے حیوانوں میں بھی ہوتی ہے، لیکن ایک حیوان کی انا کے پھولنے پھلنے کے جملہ امکانات اس حیوان کی ذات تک محدود ہوتے ہیں۔ وہ اگر دوسرے حیوانوں سے علیحدہ بھی رہے تب بھی اس کی انا کی مکمل پرورش ممکن ہے، لیکن انسان کے ساتھ ایسا نہیں۔ اسے اپنی انا اور اپنی ذات کو پروان چڑھانے کے لئے دوسری اناؤں اور دوسری ذاتوں کا کھوج لگانا پڑتا ہے۔ وہ صرف وہی نہیں ہے جو اپنے قالب میں موجود ہے۔ وہ باہر بھی ہے اسے اپنی تکمیل کے لئے ذات سے نکل کر غیر ذات میں آنا لازمی ہے۔ بادشاہت انسان کو اپنی ذات سے باہر نہیں آنے دیتی اور اسی لئے یہ سب سے بڑی بد اخلاقی ہے۔ تمام سماجی برائیوں کی جڑ ــــ بغور دیکھا جائے، تو بادشاہ چوری کرتے ہیں، بادشاہ جھوٹ بولتے ہیں، بادشاہ دغا اور فریب سے کام لیتے ہیں۔ کیوں ؟ اس لئے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہے، وہ ان کی ذات ہے۔ وہ اپنی ذات کو اپنے تک محدود تصور کرتے ہیں ــــ وہ غیر ذات میں اپنی ذات کا کھوج نہیں لگا سکتے، اسی لئے وہ حد درجہ خود غرض ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے برعکس ایک ملنسار آدمی کو چونکہ اس حقیقت کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ ذات اور غیر ذات میں فی الواقع کوئی فرق نہیں ہے، صرف قریب آنے کی کوشش کا عرصہ درمیان میں حائل ہے، اس لئے ایک سچا ملنسار آدمی کبھی سماجی برائیوں کا شکار نہیں ہوتا۔ ملنساری اس کی ذات کو سارے معاشرے کے افراد میں پھیلا دیتی ہے۔ وہ اپنی جان و مال کو دوسروں کی جان و مال تصور کرتا ہے۔ جس معاشرے میں سماجی برائیاں حد درجہ فروغ پا رہی ہوں، تو بلا تامل سمجھ لیجئے کہ اس کے افراد ایک دوسرے سے کٹتے جا رہے ہیں، ان میں ملنساری کا خاتمہ ہوتا جا رہا ہے، بادشاہوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔"

درویش آنکھیں بند کئے تقریر کر رہا تھا کہ اچانک سڑک کی ایک طرف سے ایک جیپ لہریا بناتی ہوئی اس کی جانب بڑھی اور ایک سائیکل والے کو اپنی زد میں لیتے ہوئے درویش سے آ ٹکرائی۔ درویش گر کر بے ہوش ہو گیا۔ جیپ کو ایک دس سالہ بچہ چلا رہا تھا۔ بچے کے برابر اس کے

ڈیڈی بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ پیدل چلتے لوگ غم و غصّے کی حالت میں جیپ کے پاس آئے۔ بچّے کے ڈیڈی نے انہیں ڈانٹ کر کہا:

"تمہیں اس سائیکل والے غنڈے اور بوڑھے بھکاری کا تو خیال ہے، یہ نہیں دیکھتے کہ میرے جگنو کو چوٹ آئی ہے۔"

رُکی ہوئی گاڑیاں ایک ایک کر کے چلی جا رہی تھیں اور ان میں بیٹھے ہوئے قابلِ صد احترام شریف مسافر نعرہ لگا رہے تھے:

"ہم بادشاہ ہیں ـــــ ہم بادشاہ ہیں ـــــ بادشاہت زندہ باد ـــــ بادشاہت پائندہ باد ـــــ"
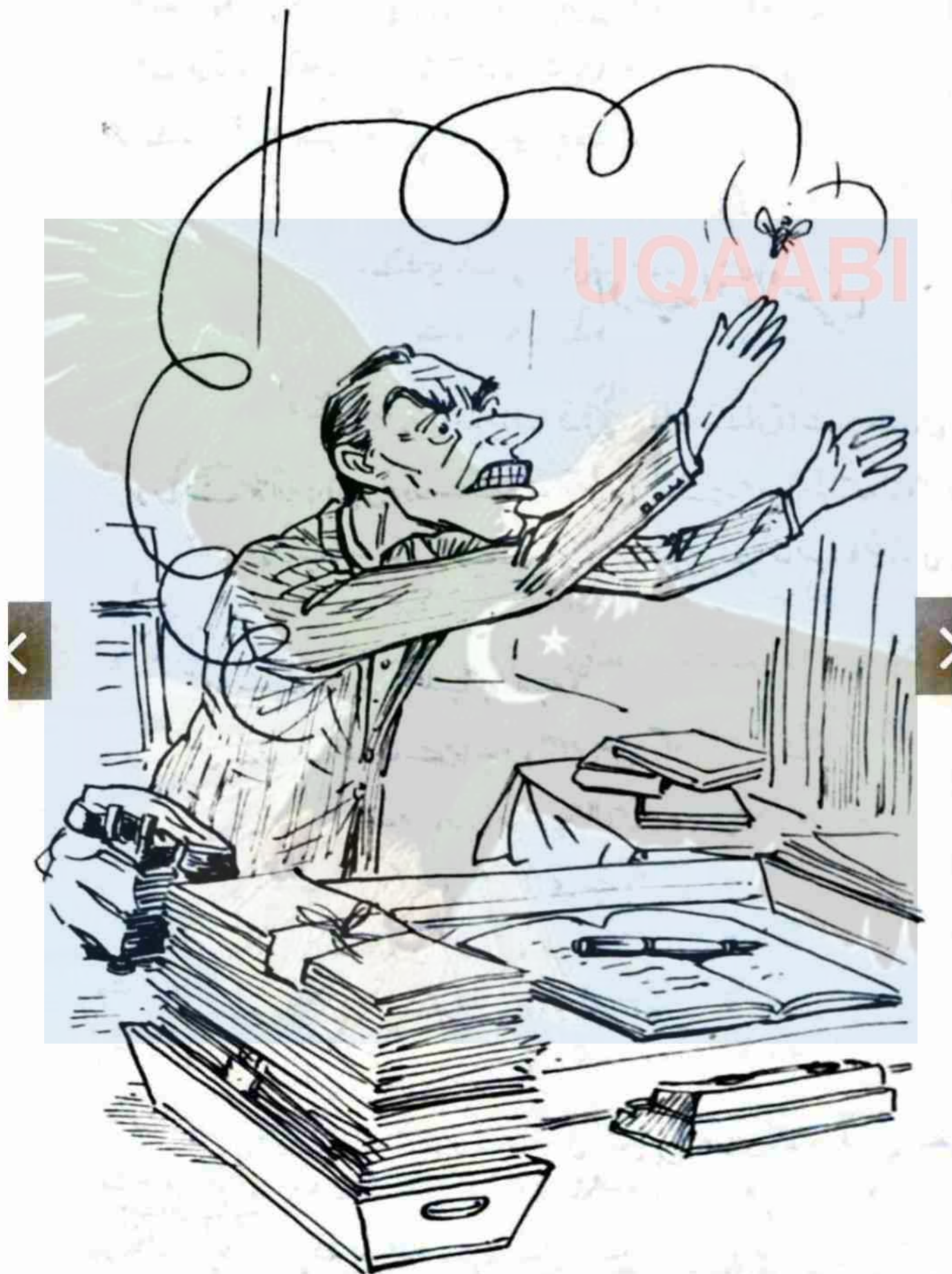
ادب اور افسری

دیکھو مسٹر، ہمیں ایک نہایت ضروری کام سے تمہارے ہاں آنا ہے۔ ریسٹ ہاؤس کو صاف ستھرا رکھنا اور ہاں، دورے کے وقت ہم کسی قسم کی جھنجھٹ پسند نہیں کرتے۔ سمجھ گئے ؟"

"بہتر ہے جناب" میں یہ کہہ کر کمرے سے باہر آیا۔ میرے پیچھے پیچھے، صاحب کا سیکرٹری بھی پہنچ گیا۔ کہنے لگا:

"سر آپ نے صاحب کا مطلب سمجھ لیا ہے ؟"

میں نے قدرے حقارت سے جواب دیا: "اس میں نہ سمجھنے کی کونسی بات تھی"۔

"سر میں صرف اس لئے عرض کر رہا تھا کہ آپ حال ہی میں تبدیل ہو کر آئے ہیں"۔

"لیکن صاحب نے ایسی کون سی مشکل بات کہی ہے ؟"

"جناب آپ جھنجھٹ کے معنی سمجھتے ہیں ؟"

"دیکھو سیکرٹری مجھے انگریز مت سمجھو، میں اردو خوب جانتا ہوں"۔

"سر اس بے ادبی کی معافی چاہتا ہوں"۔

میں نے سیکرٹری کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا: "کوئی بات نہیں" اور اس کے بعد واپس اپنے ہیڈ کوارٹر پر آگیا۔

ہمارے صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہیں ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے۔ افسر ہونے کے باوجود ایک بلند پایہ انشا پرداز اور جادو بیاں مقرر ہیں۔ شائستگی اور لطافت اُن کے

مزاج کی نمایاں خصوصیات ہیں اُنکا احساسِ جمال اس قدر نکھرا ہوا ہے کہ آپ ان کی پوری شخصیت کا عکس اس آئینے میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان سے جو بھی ملنے آتا ہے، سحر زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اُن کے لطیف ذوقِ جمال کا ایک معمولی سا واقعہ سنیئے۔ کہتے ہیں، ایک دفعہ وہ اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ شاپنگ کے لئے نکلے۔ بیگم صاحبہ نے یونہی کہہ دیا :

"ڈرائنگ، آج واٹر سیٹ آپ کی چوائس سے خرید اجائے"۔

صاحب یہ سن کر پریشان سے ہو گئے اور فرمانے لگے :

"بھئی خود ہی خرید لو تمہیں معلوم ہے میری نظرِ انتخاب ایسی ویسی نہیں"۔

بیگم اِٹھلا کر بولیں : "اسی لئے تو آپ سے کہا ہے۔ گلاس خوب صورت ہوں، تو ان میں سادہ پانی بھی آبِ حیات معلوم ہوتا ہے"۔

بیگم صاحبہ کے اس جملے پر صاحب پھڑک اُٹھے اور واٹر سیٹ کی جستجو شروع ہو گئی۔ کئی دُکانیں دیکھی گئیں، خدا خدا کر کے صاحب کو ایک ڈیزائن پسند آیا۔ دُکاندار واٹر سیٹ پیک کرنے لگا، تو صاحب نے گھُرک کر کہا :

"ارے، کیا کر رہے ہو؟ ابھی تو صرف ڈیزائن ہی پسند آیا ہے، ذرا گلاس میرے نزدیک تو لاؤ"۔ ہر گلاس دوسرے گلاس کے برابر رکھ کر دیکھا گیا۔ بظاہر ان کے قد یکساں تھے، لیکن صاحب کی باریک بین نگاہ میں بال برابر فرق بھی کانٹا بن کر کھٹک رہا تھا۔ زچ ہو کر بولے : "لاحول ولا قوۃ! یہ ولایت کی فیکٹریاں بھی سانچے دیکھ بھال کر نہیں بناتیں"۔ اس کے بعد گلاس کے پیندے ایک دوسرے سے ملائے گئے۔ غالباً ہاتھ ہل جانے کی وجہ سے ان میں بھی بے معلوم سا فرق نظر آتا تھا۔ صاحب کی ناک مسلسل سکڑ اور پھیل رہی تھی۔ دُکان میں اُس ڈیزائن کے جتنے بھی گلاس موجود تھے، نکال لئے گئے۔ پیندوں کے بعد کنارے دیکھے گئے۔ بال سے باریک فرق تو یہاں بھی موجود تھا۔ غرض دو اڑھائی گھنٹے کی ریاضت کے بعد پندرہ سولہ درجن میں سے ایک درجن منتخب ہوئے۔ صاحب سے زیادہ، بیگم صاحبہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ شوفر اور ایک ملازم کے علاوہ غریب دُکاندار کے چہرے پر بھی خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔

جیسے ایک طویل قید سے رہائی مل گئی ہو۔ گلاس پیک ہونے لگے، تو کہیں ایک گلاس دوسرے سے ٹکرا گیا۔ صاحب نے فوراً کہا: "ذرا ٹھہرو، یہ آواز بے سُر معلوم ہوتی ہے۔ تمام گلاس ایک دوسرے سے ٹکرا کر دکھاؤ۔ کہیں اسی طرح سب کی آوازیں مختلف تو نہیں۔" حکم کی تعمیل ہوئی اور صاحب نے آواز پر کان لگا دیئے۔ باقی سب آوازیں ٹھیک نکلیں، لیکن ایک گلاس کی آواز ذرا مختلف تھی۔ آواز کے اس فرق کو صرف صاحب ہی محسوس کر رہے تھے۔ بیگم تنگ آ کر بولیں:

"ڈارلنگ، گلاس بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ آواز کا اس قدر باریک فرق کون محسوس کر سکتا ہے؟"

صاحب نے غضب آلود لہجے میں کہا: "بیگم اہلِ ذوق ہی اس فرق کو محسوس کر سکتے ہیں۔" اُس گلاس کو ایک دوسرے سے دوبارہ ٹکراتے ہوئے بولے: "ذرا غور سے سنو، دوسرے تمام گلاس ٹ، ٹزیزن، ٹن کی آواز نکالتے ہیں، یہ کم بخت ٹ، ٹزیزن، ٹن کی آواز دیتا ہے۔" بیگم جھنجلا کر بولیں: "او مائی گاڈ، آپ بھی کمال کرتے ہیں، گلاس مجھے دیجئے۔" یہ کہہ کر بیگم نے وہی دونوں گلاس ذرا زور سے ٹکرائے اور بولیں "دیکھیے، اب تو یہ بھی ٹ، ٹزیزن ہی کی آواز دے رہا ہے۔" غرض یوں بہ ہزار دقت، پانی پینے کے ایک درجن گلاس خریدے گئے۔ ملاحظہ فرمایا اسے کہتے ہیں احساسِ جمال:

میرے چارج سنبھالنے کے بعد اس علاقے میں صاحب کا یہ پہلا دورہ تھا۔ میں ذرا بھی خائف نہ تھا۔ میں نے صاحب کی طنز و مزاح سے بھرپور تقریروں کے اقتباسات اخباروں میں پڑھ رکھے تھے، ان میں بلا کی سوجھ بوجھ اور دردمندی کا احساس رواں دواں تھا۔ اہلِ قلم کتنے ہی بددماغ کیوں نہ ہوں، ان کی انسانیت برقرار رہتی ہے۔

تاریخ مقررہ پر وقتِ معینہ سے کچھ دیر پہلے ریسٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ گاڑی سے اترتے ہی مجھے اس مظلوم بڑھیا کا سامنا ہوا جس نے صاحب کی خدمت میں ایک درخواست دے رکھی تھی۔ بڑھیا نے مجھے سلام کرتے ہوئے کہا:

"صاحب، آج مجھے بڑے صاحب سے ضرور ملوا دو۔"

"ہاں، ہاں، ہمارے صاحب تو بہت اچھے ہیں۔ ایک ہی ملاقات میں تمہارا کام بن جائے گا۔"

میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"جناب میں نے بھی یہی سنا ہے کہ بہت اچھے انسان ہیں —— کئی بار اُن سے ملنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکام رہی۔"

"تم پہلے نہیں مل سکیں، تو کیا ہوا آج مل لینا۔"

میرے اس فقرے پر سیکرٹری کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ بے چین تو وہ پہلے ہی سے تھا، لیکن اس وقت اس کی بے کلی کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو گئی تھی۔ وہ بے اختیار سا ہو کر کہنے لگا:

"سر، آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"سر، بڑے صاحب ایک نہایت ضروری کام سے تشریف لا رہے ہیں۔"

"ہاں، ہاں، مجھے معلوم ہے، پھر کیا ہوا؟"

"سر، میرا مطلب ہے، بڑے صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ کسی قسم کا جھنجھنٹ پسند نہیں فرماتے۔"

"مجھے یہ بھی معلوم ہے۔"

"سر، آپ جھنجھٹ کے معنی تو خوب سمجھتے ہوں گے، سو......"

"لاحول ولاقوۃ، ارے بھئی میں ہر بات سمجھتا ہوں۔ تم کسی قسم کا فکر نہ کرو۔"

"سر، گستاخی معاف، اگر آپ ہر بات سمجھتے ہیں، تو پھر...... تو پھر۔"

"تم جاؤ، اپنا کام کرو، مجھے ناحق پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے تنگ آکر کہا اور سیکرٹری گومگو کی حالت میں میرے پاس سے چلا گیا۔

ہمارے صاحب خصوصاً دورے کے موقعہ پر پابندیٔ وقت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ دس بجنے میں دو منٹ باقی تھے کہ سامنے سے کار آتی دکھائی دی۔ جیسے ہی وہ قریب آکر رکی میں نے آگے

بڑھ کر اس کا دروازہ کھولا۔ صاحب کو خوش آمدید کہا، ان کے چہرے پر متانت اور شفقت کے ملے جلے جذبات نمایاں تھے۔ میرے شانے پر بڑے پیار سے ہاتھ رکھ کر مزاج پرسی کی۔ میں اس عنایت کا شکریہ ادا کرنے ہی والا تھا کہ صاحب کی نظر اس بڑھیا پر پڑ گئی جو اپنا دکھڑا سنانے کے لئے ہمارے بہت قریب آ چکی تھی، صاحب نے ایک دم آگ بگولا ہو کر میری طرف دیکھا،

"مسٹر، تم خاصے بیوقوف معلوم ہوتے ہو۔ میں نے تمہیں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں تمہارے پاس بہ ضروری کام سے آ رہا ہوں، لیکن تم نے اس کی ذرا پرواہ نہ کی۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں عموماً دوروں پر کسی قسم کا جھنجھٹ پسند نہیں کرتا۔" پھر اپنے سیکرٹری سے مخاطب ہو کر بولے "کیوں سیکرٹری! کیا ہم نے جھنجھٹ کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا؟"

"یس سر! آپ نے استعمال فرمایا تھا۔"

"تم نے صاحب کو اس کے معنی سمجھا دیئے تھے؟"

"یس سر..... یس..... سر..... میں نے صاحب..... سے..... پوچھا تھا۔"

"کیا پوچھا تھا؟"

"یہی، کیا وہ جھنجھٹ کے معنی سمجھتے ہیں؟"

"پھر کیا ہوا؟"

"موصوف نے فرمایا تھا کہ وہ اس لفظ کے معنی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔"

سیکرٹری صاحب کا یہ جواب سُن کر صاحب نے قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولے:

"معلوم نہیں، تم کس طرح افسر بن گئے ہو۔ مجھے تم پر کڑی نگرانی رکھنی ہو گی۔"

اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں تشریف لے گئے اور اس بڑھیا کو دھکے دے کر بنگلے کی حدود سے باہر نکال دیا گیا۔

بڑھیا برابر چلاتی رہی: "اے بیٹا! تم دیکھنے میں بہت اچھے نظر آتے ہو، تمہارے چہرے پر شرافت کی

نور بھی جھلکتا ہے۔ تم باتیں بھی بڑی نرمی سے کرتے ہو۔ سنا ہے کہ تم بہت پڑھے لکھے بھی ہو۔ ان تمام باتوں کے باوجود بیٹا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مجھ دکھیا کی بات کیوں نہیں سنتے۔ آج تم مجھے خستہ حالت میں دیکھ رہے ہو تو کیا ہوا۔ میں بھی ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔"

میرا کمرہ صاحب کے کمرے سے ملحق تھا۔ میں ابھی آکر بیٹھا ہی تھا کہ چپڑاسی نے آکر کہا:

"حضور! بڑے صاحب یاد فرما رہے ہیں۔"

میں صاحب کے کمرے میں پہنچا، صاحب کی تیوری اسی طرح چڑھی ہوئی تھی۔ میری آمد کو محسوس کر کے میری طرف دیکھے بغیر فرمایا:

"مسٹر! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں بہت حساس ہوں۔ مجھ سے کسی حاجت مند کی چیخ پکار سنی نہیں جاتی۔ اس بڑھیا سے کہہ دو کہ ہمارے ہیڈ کوارٹر آجائے، ہم اُس کی حاجت پوری کر دیں گے۔"

"لیکن جناب!" میں کچھ کہنے کو تھا کہ صاحب بولے:

"لیکن ویکن کے لئے ہمارے پاس کوئی وقت نہیں۔ تم جانتے نہیں، مجھے پرسوں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرنا ہے اور میں اس کے لئے کچھ لکھ رہا ہوں۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میری تحریر عام لوگوں جیسی نہیں ہوتی۔ میں تو اس کے لئے بڑے درد و کرب سے گزرتا ہوں۔"

میں نے بڑی مشکل سے بڑھیا کو ٹالا۔ وہ یہی کہتی رہی، "بڑے صاحب ہر دفعہ کوئی دوسری تاریخ دے ڈالتے ہیں اور جب وہ تاریخ آتی ہے، تو میری بات خود نہیں سنتے، مجھے اپنے منشی یا کسی دوسرے ماتحت کے حوالے کر دیتے ہیں۔ میں نے کئی بار اُن سے درخواست کی، مجھے پانچ منٹ دے دیجئے، لیکن وہ ہمیشہ یہی فرماتے ہیں کہ ہم نے تمہاری ساری بات سمجھ لی ہے اور اگر کوئی بات رہ گئی ہے، تو تفصیل سے میرے ماتحت کو سمجھا دو۔ جب میں ماتحت کو اپنا دکھڑا سناتی ہوں، تو وہ توجہ نہیں دیتا اور اگر کچھ سنتا ہے تو یہی کہتا ہے: مائی! بات لمبی نہ کرو، اختصار سے بتاؤ۔ مختصر الفاظ میں بات کرتی ہوں، تو وہ کہتا ہے: بڑی بی! ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آئی، خبر نہیں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ بیٹا! میری کوئی نہیں سنتا۔"

میں نے صاحب کے سیکرٹری کی نوٹ بک میں بڑھیا کی تاریخ نوٹ کرا دی اور سیکرٹری سے خود بھی کہا کہ وہ

خاص توجہ دے کر اس غریب کا کام کرا دے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سیکرٹری نے میری بات کو ناتجربہ کاری پر محمول کیا ہے۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ برابر والے کمرے سے صاحب کے گرجنے کی آواز آئی:

"چپڑاسی!"

"جی حضور!"

"میں کہتا ہوں آج تم مجھے لکھنے دو گے یا نہیں؟"

"کیا حکم ہے جناب؟"

"حکم کے بچے، تمہیں معلوم نہیں میں آج ایک ضروری تقریر لکھ رہا ہوں۔"

"جی جناب!"

"ارے کم بخت، اس شور کو بند کیوں نہیں کرتا!"

"کیسا شور حضور؟"

"اچھا، تو بہرہ بھی ہو گیا ہے۔ کیا تجھے اس وقت کوئی شور سنائی نہیں دے رہا؟"

چپڑاسی نے قدرے توقف سے کہا: جی۔۔۔۔۔ ہاں جناب، شور سنائی دے رہا ہے۔"

"تو پھر اسے بند کیوں نہیں کرتا؟"

"لیکن حضور، یہ شور تو ہوائی جہاز کا ہے۔"

"ہمیں کچھ غرض نہیں کہ یہ شور کس کا ہے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ فوراً بند ہو جائے۔"

"بہتر جناب!" چپڑاسی نے صاحب کی عادت کو سمجھتے ہوئے حکم بجالانے کا اقرار کیا۔ شور کا بند ہو جانا یقینی تھا۔ اتفاقیہ طور پر ایک ہوائی جہاز نیچی پرواز سے چلا آ رہا تھا۔ پھر نہ جانے کیوں اس نے ایک دو چکر لگائے اور اپنی منزل کی طرف چلا گیا۔

ہوائی جہاز گزرے مشکل سے دس پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ صاحب کی آواز پھر گونجی:

"چپڑاسی!"

"جی حضور"

"یہ شائیں شائیں اور شوں شوں کی آواز کیسی ہے؟"

"جناب، یہ آواز تیز ہوا کے چلنے سے پیدا ہو رہی ہے۔"

"اُف خدایا! آج تقریر کیونکر لکھی جا سکے گی"۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولے "چپڑاسی اس ہوا کا کوئی انتظام نہیں کر سکتے! بھئی جس طرح بھی ہو اسے اپنی جگہ کھڑا کر دو۔ اس کے پاؤں میں زنجیر ین ڈلوا دو"۔ پھر اپنے آپ سے کہنے لگے "واہ! میرے منہ سے اس وقت کیا خوب جملہ ادا ہوا ہے ۔۔۔ ہوا کے پاؤں میں زنجیریں۔ سبحان اللہ!" چپڑاسی موقع غنیمت جان کر چپکے سے باہر نکل آیا۔

میں تنہا بیٹھے بیٹھے عجیب قسم کی بوریت محسوس کر رہا تھا۔ مجھے نیند سی آنے لگی۔ ابھی میری اونگھ کا آغاز ہی تھا کہ برابر کے کمرے سے چٹ چٹاچٹ ۔۔۔۔۔ چٹ ۔۔۔۔۔ چٹ ۔۔۔۔۔ تھپ ۔۔۔۔۔ تھپ ۔۔۔۔۔ چٹ چٹاچٹ ۔۔۔۔۔ کی آوازیں آنے لگیں۔ یا الٰہی، یہ ماجرا کیا ہے؟ پانچ دس منٹ تک یہ آوازیں رُک رُک کر آتی رہیں۔ میں حیران تھا کہ یہ کس قسم کی آوازیں ہیں۔ بعد میں چپڑاسی سے پتہ چلا کہ صاحب لکھنے میں مصروف تھے کہ ایک گستاخ مکھی کمرے میں گھس آئی۔ پہلے وہ صاحب کے قلم کی نوک پر بار بار بیٹھتی رہی اور پھر اس نے موصوف کے کان پر بیٹھنا شروع کر دیا اور اس کے بعد اس نے صاحب کی ناک کو اپنا ہدف بنایا۔ صاحب ٹھہرے نازک مزاج، سمجھے شاید اُن کا چہرہ صاف نہیں ہے، چنانچہ وہ غسل خانے میں گئے، خوب اچھی طرح سے چہرہ صابن سے دھویا اور اسے تولیے کے ساتھ خوب رگڑا، لیکن جونہی میز پر لکھنے کے لئے دوبارہ بیٹھے، گستاخ مکھی نے پھر وہی حرکت کی۔ اب صاحب کے غصّے کی انتہا نہ رہی۔ فوراً چپڑاسی کو بلایا اور اس مکھی کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔ اتفاق دیکھیے سارے کمرے میں ایک ہی مکھی تھی، اس لئے زد میں نہیں آ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے صاحب اور چپڑاسی نے مل کر مکھی کا خاتمہ کیا۔ چپڑاسی کی زبانی یہ حقیقتِ حال سُن کر مجھے شدید احساس ہوا کہ واقعی لکھنے لکھانے کا کام بڑا ہی نازک ہے۔

شام کو چائے پر صاحب نے مجھے پھر یاد فرمایا۔ اس وقت ان کا موڈ بہت اچھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے:

"میاں! لوگ بھی کیا یاد کریں گے کہ کیسا افسر آیا تھا۔ خدا کی قسم! ایک فقرہ تو کوئی ایسا لکھ کر دکھائے۔ آج کل کے ادیب ...... بس کچھ نہ پوچھو۔ نرے احمق ہیں۔ ہمیں دیکھو! ہم افسری بھی کرتے ہیں اور قلم بھی چلاتے ہیں۔ سبحان اللہ! آج وہ تقریر لکھی ہے کہ لوگ سنیں گے اور سر دھنیں گے۔ اخباروں میں دھوم مچے گی ـــــ ایک ایک جملے میں طنز کا ایسا تیکھا پن پیدا ہو گیا ہے کہ یہ تقریر یقیناً ادبِ عالیہ میں شمار ہو گی۔"

میں نے صاحب کا موڈ اچھا دیکھا، تو خیال آیا کہ ان کے سامنے وہ ضروری فائل کیوں نہ پیش کر دوں جس پر خود موصوف نے لکھا تھا کہ آئندہ دورے پر پیش کی جائے ـــــ یہ خیال آتے ہی میں اُٹھنے لگا، تو صاحب بولے:

"کہاں چلے؟"

"سر، وہ ضروری فائل لانا چاہتا تھا جس پر آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ بر وقتِ دورہ پیش ہو۔"

میرے یہ الفاظ سنتے ہی صاحب کا موڈ یک لخت خراب ہو گیا۔ کہنے لگے:

"میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ، تم ایسا بدذوق انسان آج تک نہیں دیکھا۔ غضب خدا کا! یہ وقت فائل پیش کرنے کا ہے؟"

صاحب مسلسل خفا ہو رہے تھے اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ بہر حال بڑی منت سماجت کے بعد صاحب کو منایا ـــــ وہ اس بات پر راضی ہوئے کہ میں موصوف کی تقریر سننے کے لئے شہر ضرور حاضر ہوں گا؛ چنانچہ حسبِ وعدہ تقریر سننے گیا۔ تقریر واقعی نہایت عمدہ تھی۔ ان کی تقریر کا کچھ حصہ مجھے اب تک یاد ہے:

"ہم لوگ بڑے خود غرض ہیں اور اپنی خود غرضیوں کو طرح طرح کے معانی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی ہماری خود غرضی، شائستگی کا روپ دھارتی ہے، کبھی شرافت کا۔ ہمیں خود غرضیوں کے مختلف سوانگ سے بچنے کی سخت ضرورت ہے۔ ہماری تمام تر غیر ذمہ داریوں اور بد دیانتیوں کا سرچشمہ یہی خود غرضیاں ہیں۔ ان خود غرضیوں کا سب سے بھیانک پہلو یہ ہے کہ ہم انہیں اپنے علم و دانش اور

ہنر مندی کے ذریعے خوب صورت الفاظ کے پیکر عطا کرتے ہیں۔ لفظوں کے جادو اور حسن سے ہماری نگاہیں خیرہ ہونے لگتی ہیں۔ لفظوں کے اس فریب سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ انسان کی حقیقی عظمت انسانیت کی خدمت کرنے میں ہے۔ اس سلسلے میں خلفائے راشدین کی مثالیں سامنے رکھنی چاہئیں۔ حضرت عمرؓ کا وہ واقعہ آپ کو یاد ہوگا جب وہ ایک مظلوم بڑھیا کے لئے کھانے پینے کی چیزیں اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لے گئے تھے.........!"

لوگ جلسہ ختم ہونے کے بعد بھی بڑی دیر تک صاحب کو گھیرے میں لئے رہے۔ میری بدقسمتی دیکھیئے کہ مجھے بار بار اُس بڑھیا کا خیال آ رہا تھا جو صاحب سے ریسٹ ہاؤس میں ملنے کے لئے آئی تھی۔ جب میں نے اس بڑھیا کو ٹالنے کے لئے کہا تھا کہ مائی، اب چلی جاؤ، صاحب تمہارا کام کردیں گے، وہ بڑے ہمدرد اور سمجھ دار انسان ہیں، تو اس پر اُس نے جواب دیا تھا:

"بیٹا، یہی تو افسوس ہے کہ صاحب ہمدرد اور سمجھ دار ہو کر میرا کام نہیں کرتے۔ اس عہد میں ہمدردی کو ہمدردی ڈس رہی ہے اور شعور کو شعور۔ صاحب سمجھ دار اور ہمدرد انسان نہ ہوتے، تو شاید مجھے اتنی ذہنی کوفت نہ ہوتی، یا پھر میں جاہل اور اَن پڑھ ہوتی، تو شاید میرے احساس کا یہ عالم نہ ہوتا۔"

مَیں بڑی مشکل سے بڑھیا کا خیال اپنے دل سے نکالتا تھا، تو وہ ضروری فائل میرے سامنے آ جاتی تھی جسے صاحب ایک عرصے سے مسلسل التوا میں ڈالے ہوئے تھے۔ غرض اتنے نفیس اور پاکیزہ ماحول میں ہونے کے باوجود میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ لوگ اسی طرح صاحب کے گرد جمع تھے۔ میں نے دیکھا کہ صاحب سب کو چھوڑ چھاڑ کر میری طرف آ رہے ہیں۔ آتے ہی پوچھا:

"ہماری تقریر کیسی رہی؟"

"سر! سبحان اللہ! کیا کہنے، ماشاء اللہ۔ واہ واہ ـــــ لطف ہی تو آگیا۔ کیا تیور ہیں! زندگی میں پہلی بار ایک اچھی تقریر سُنی ہے۔" میں اسی طرح داد دیئے چلا جا رہا تھا کہ ڈرائیور نے میرے قریب آ کر کہا:

"صاحب، گاڑی حاضر ہے۔"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا:

"اور بڑے صاحب؟"

"وہ تو جناب سے ہاتھ ملا کر تشریف لے جا چکے ہیں۔"

میں نے دیکھا واقعی نہ صرف صاحب، بلکہ قریب قریب تمام لوگ جا چکے ہیں اور میں تنہا جلسہ گاہ میں کھڑا داد دے رہا ہوں۔ میں نے اپنی بدحواسی پر لاحول پڑھی اور گاڑی میں بیٹھ کر واپس ہو لیا۔ اونچے لوگ، اونچا شہر اور اونچا ماحول مجھ سے دور ہوتا جا رہا تھا لیکن جیسے جیسے فاصلہ بڑھتا گیا، میری گھٹن کم ہوتی گئی۔ میں نے سوچا بڑھیا کا کام خود ہی کروں گا۔ بڑے صاحب کو ادبی تخلیقات کے لئے بھی کچھ وقت ملنا چاہیئے اور وہ ضروری فائل ——— فائل کا کیا ہے، اُس پر کبھی نہ کبھی دستخط ہو جائیں گے، ورنہ چراغ دین کے حوالے اُسے کسی وقت بھی کیا جا سکتا ہے۔

دفتر کی کُنجی

اپنی ہر چیز کو بُرا سمجھنا ہم پاکستانیوں کی کچھ عادت بن گئی ہے، ورنہ سچ پوچھئے، تو ہمارے دفتروں میں بہت کام ہوتا ہے اور بڑی خوبی سے ہوتا ہے۔ پھر مزید لُطف کی بات یہ ہے کہ بہت جلدی ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ اپنے اندازے کے مطابق سوچتے ہیں کہ ایک کام دو مہینے میں بھی ہو جائے تو غنیمت ہے، لیکن آپ کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب وہ کام آنکھ جھپکنے میں ہو جاتا ہے۔

ہمارے دفتروں میں چپڑاسی سے لے کر اعلیٰ افسر تک سب کام کرتے ہیں، نہایت صفائی سے کرتے ہیں، نہایت ذمہ داری سے بجا لاتے ہیں۔ ہمارے دفتروں میں وقت کی بہت قدر و قیمت ہے، یہاں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا جاتا، بظاہر آپ کو نظر آئے گا فلاں میز پر بیٹھے ہوئے اہلکار صاحب اونگھ رہے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ یا تو کسی خاص اور اہم مسئلے پر سوچ بچار کر رہے ہوتے ہیں یا پھر اس بات سے بور ہیں کہ آج کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی کام کیوں نہیں۔ کہیں آپ کو چائے کا دور چلتا دکھائی دے گا، لیکن حقیقت میں چائے کے دور میں بھی کسی کام کی تخلیق ہو رہی ہوگی یا کوئی کام تکمیل کو پہنچ رہا ہوگا، ورنہ پھر کام زیادہ ہونے کی وجہ سے اہل کار صاحب معہ اپنے لواحقین، خود کو مستعد یا تر و تازہ کر لے کی سعی فرما رہے ہوں گے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ہمارا گزر ایک دفتر کے عین بیچ سے ہوا۔ ہم نے دیکھا ایک صاحب موج میں آ کر نہایت سُر تال کے ساتھ میز بجا رہے ہیں، سامنے والی میز پر ایک صاحب اُن سے زیادہ

موج میں ہیں اور رقص فرما رہے ہیں۔ خالد صدیقی میرے ساتھ بیٹھے کہنے لگے :

"کیوں مشکور بھائی، اب کہو اس وقت یہ صاحبان کون سا کام سرانجام دے رہے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "کمال ہے، اتنی سی بات نہیں سمجھتے یہ اس وقت اپنے آپ کو کسی عظیم کام کے لئے تیار کر رہے ہیں"۔

خدا کے فضل سے ہمارے دفتروں میں نظم و ضبط یعنی ڈسپلن پوری طرح موجود ہے، لیکن ایسا نظم و ضبط نہیں جس میں ہمیں کسی قسم کی گھٹن کا احساس ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ عوام میں سے کوئی دفتر میں آئے اور اسے سانس لینا دشوار ہو جائے، پھر عام لوگوں کا ذکر کرنا بھی فضول ہے کہا جاتا ہے انہیں تو آج تک آزادی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ سچ پوچھیے تو ہمارے ملک میں آزادی کی لاج رکھنے والے یہی دفتر کے لوگ ہیں۔ اگر یہ حضرات بھی اپنے طور طریقوں سے آزادی کا اظہار نہ کرتے، تو ہمیں کس طرح پتہ چلتا کہ ہم آزاد ہو گئے ہیں، چنانچہ اگر ہمارے دفتروں میں اہل کار وقت پر نہیں آتے، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنے فرائض سے غفلت برت رہے ہیں یا خدانخواستہ کام چور ہیں۔ اپنے اس فعل سے اہل کار صاحبان ہم جاہل عوام کو صرف یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ بے وقوفو! کچھ سوچو، کچھ سمجھو، ہم آزاد ہو گئے ہیں، اب ہمارے لئے ضروری نہیں کہ وقت پر دفتر آئیں، جو کام کرنے کا ہے اسے فوراً کر ڈالیں۔ صرف تنخواہ پر گزارا کریں، افسر کا کہا مانیں، ہم دفتر بھی آئیں گے، لیکن اپنی مرضی سے، ہم کام بھی کریں گے، لیکن جب ہمارا موڈ ہوگا، رہی یہ بات کہ صرف تنخواہ پر گزارا کریں اور افسر کا کہا مانیں، یہ ذرا غور طلب امور ہیں۔ ویسے ہم پر کوئی ایسا منحوس مہینہ بھی آجاتا ہے جب ہمیں صرف تنخواہ پر گزارا کرنا پڑتا ہے، ہم افسر کا کہا بھی مان لیتے ہیں جب واقعی افسر یہ چاہتا ہے کہ ہم اُس کا کہا مانیں۔

صدیقی کا کہنا ہے کہ ہمارے دفتر ایک معمہ ہیں۔ میری حقیر رائے یہ ہے کہ ہمارے دفتر کوئی معمہ نہیں۔ وہ وقت پر کھلتے بھی ہیں، ان میں کام بھی ہوتا ہے، بلکہ کام تو ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دیکھے اور حیران ہوتا چلا جائے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ کسی دفتر میں جانے سے قبل ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہونا

چاہیئے، اس دفتر کا افسر کون ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دفتر کی روحِ رواں افسر ہوتا ہے۔ اگر آپ نے معلوم کر لیا کہ دفتر کا افسر کون ہے، تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے اس دفتر کو جیت لیا۔ اب آپ کا ہر کام تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ واہ صاحب یہ معلوم کرنا بھی کوئی مشکل کام ہے کہ دفتر کا افسر کون ہے، دفتر میں جائیے، کمروں کی دیوار پر اہلکاروں کے ناموں کی تختیاں پڑھیے، جو اہلکار سب سے بڑا افسر ہو گا، اس کے نام کی تختی آپ کو خود بتا دے گی کہ کون اس دفتر کا افسر اعلیٰ ہے۔ لیکن ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ہمارے دفتر اور ہر اعتبار سے واضح اور آشکار ہیں، مگر یہ معلوم کرنا واقعی ایک معمّہ ہے کہ ان میں صحیح معنوں میں افسر کون ہے۔ اس کے لئے کافی ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں تب کہیں جا کر پتہ چلتا ہے دفتر کا اصلی افسر کون ہے۔

ہم ایسے ناسمجھ عوام بڑے افسروں سے ملاقات کر کے ان سے ہاتھ ملا کر، ان کی مسکراہٹ سے متاثر ہو کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ متعلقہ دفتر کے افسروں سے مل آئے ہیں، بس اب کام بن جائے گا۔ لیکن بار بار ان کی خدمت میں جا کر بھی جب کام نہیں بنتا، تو اپنے آپ سے الجھتے ہیں۔ ان اعلیٰ افسروں کو ان کی پیٹھ پیچھے بُرا بھلا کہتے ہیں، پریشان ہوتے ہیں کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے، ہم افسروں سے بھی مل لئے، وہ ہم سے بڑے اخلاق کے ساتھ بھی پیش آئے، انہوں نے ہم سے کام کا وعدہ بھی فرمالیا ان تمام حقائق کے باوجود ہمارا کام پھر بھی نہیں بنتا۔ دراصل ہمارے ان دفتروں یا افسروں میں کوئی خرابی نہیں، اصل خرابی ہماری لاعلمی اور جہالت کی ہے، یعنی ہم متعلقہ دفتر کے اصلی افسر کو نہیں پہچان سکے۔

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ہمارے دفتروں کے اعلیٰ افسر نہایت خلیق اور شائستہ ہوتے ہیں، وہ لکھنا پڑھنا بھی جانتے ہیں، انہیں اپنے کام کی شُدبُد بھی ہوتی ہے، غرض ہمارے اعلیٰ افسر سب کچھ ہوتے ہیں۔ اگر نہیں ہوتے، تو وہ افسر نہیں ہوتے۔ اسی لئے بڑے افسروں سے مل کر ہمیں یہ احساس تو ہوتا ہے کہ ہم سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے کے افراد سے ملاقات کر کے آ رہے ہیں۔ یہ احساس ہرگز نہیں ہوتا کہ افسروں سے مل کر آ رہے ہیں۔ ممکن ہے آپ کے خیال میں افسر کے معنی کچھ اور

ہوں، ہم تو افسر اسے سمجھتے ہیں جس کا حکم دفتر میں چلتا ہو، جس کے اشارے پر آپ کا کام تکمیل کو پہنچ جائے۔ عام طور پر ہمارے اعلیٰ افسروں کے کمرے تو بڑے سجے سجائے ہوتے ہیں، وہ خود بھی بڑے ٹھاٹ سے کرسی پر بیٹھے نظر آئیں گے، باہر سے آنے والے پر ان کا رعب بھی خوب پڑتا ہے، ان کے دفتر کے سامنے ملاقات کا وقت بھی لکھا ہوتا ہے، چپڑاسی بھی آپ کو بغیر اجازت اندر نہیں جانے دیتا۔ غرض ایک دفعہ تو آپ کو پوری طرح یقین ہو جاتا ہے کہ ہم جس سے ملنے کے لئے آئے یا مل کر آرہے ہیں ——— واقعی وہی اس دفتر کا افسر ہے، لیکن جلد ہی یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ یہ صاحب آپ کے لئے اور سب کچھ کر سکتے ہیں، آپ کا کام نہیں کر سکتے۔ گویا دفتر سے متعلق کام کرانا ان کے بس کی بات نہیں۔ ویسے اگر آپ اُن سے گپ شپ لگانے کے لئے آئے ہیں، تو وہ آپ کو چائے بھی پلا سکتے ہیں، آپ کو اپنا دوست بھی بنانے میں انہیں کوئی عذر نہیں ہوگا، لیکن جیسے ہی آپ نے اُن سے کام کے لئے کہا، ان کی پیشانی پر بل پڑ جائیں گے، تیوری چڑھ جائے گی اور آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ بے عزت ہو کر رہ گئے ہیں۔ گویا ہمارے افسر کام کے لیے دفتر میں نہیں بیٹھتے، محض دکھاوے کے لئے تشریف فرما ہوتے ہیں اور ان صاحبوں کے کمرے دفتر کا حصہ نہیں شو رُوم کا درجہ رکھتے ہیں۔ اصل بات یہی ہے کہ ہمارے اعلیٰ افسر، افسر نہیں ہوتے، اسی لئے جب اُن سے کام کے لئے کہا جاتا ہے، تو ناک بھوں چڑھا کر ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ صاحب ہم افسر نہیں ہیں۔ ہم سے ایسی بات کیوں کہتے ہو جس سے ہمارا تعلق نہیں۔ دفتر کا افسر کوئی اور شخص ہے، ہم تو صرف دستخط اور لوگوں سے ملاقاتیں کرنے کے لئے یہاں بیٹھے ہیں، چنانچہ جہاں تک ملاقاتوں اور دستخطوں کا تعلق ہے، یہ حضرات ان ہر دو کاموں کو جوں توں کر کے سرانجام دے ہی ڈالتے ہیں۔ ملاقات میں تو پھر بھی کچھ تکلف سے کام لیتے ہیں، دستخط کرنے میں تو اس قدر مستعدی دکھاتے ہیں کہ عموماً یہ اپنا قلم آنکھیں بند کر کے چلاتے ہیں۔

جب ہم ناتجربہ کار تھے، تو اس بات پر حیران ہوتے تھے کہ آپ ایک افسر کے پاس اس کے دفتر سے متعلقہ کوئی کام لے کر جائیں اور وہ ناراض ہو جائے، لیکن تجربے نے ہم پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح کر دی کہ افسروں کے پاس کوئی کام لے کر جانا اپنے آپ کو سخت ذلیل و خوار کر دینے کے

مترادف ہے۔ ہمیں یہ تجربہ تو ابھی تک نہیں ہوا کہ جس افسر سے آپ کی کوئی واقفیت نہ ہو، وہ آپ کے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے؛ البتہ جانے پہچانے افسروں کے پاس ہم اکثر گئے ہیں اور ہمیں اکثر اپنی عزّت خاک میں ملتی نظر آئی ہے۔

ایک دفعہ ہمارے علاقے کے ایک معمولی سے اہل کار کا تبادلہ ہوگیا۔ اس غریب کو یہاں آئے ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ جس اہل کار کو اس کی جگہ لایا جا رہا تھا، اس کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی؛ بلکہ شکایت کے طور پر اسے تبدیل کیا گیا تھا۔ اس علاقے کے افسرِ اعلیٰ ہمارے کرم فرما تھے۔ ہم نے صورتِ حال سے موصوف کو آگاہ کر دیا۔ صاحب موصوف نے وعدہ فرما لیا کہ تبادلہ منسوخ کر دیا جائے گا، بلکہ ہدایت کی کہ ہم فوراً چھوٹے صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں۔ حسبِ ہدایت چھوٹے صاحب کے پاس گئے۔ انھوں نے بھی ہمارے خیال کی تصدیق فرمائی اور اپنے سے چھوٹے صاحب کو بلایا۔ ان چھوٹے صاحب نے بھی ہم سے کہہ دیا کہ تبادلہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ ہم نے اس اہل کار سے جا کر کہا لو میاں تمہارا کام بن گیا۔ دوسرے ہی روز وہ ہمارے پاس روتا ہوا آیا، جناب مجھے سب سے چھوٹے صاحب تنگ کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ فوراً چارج دے دو، ورنہ برخاست کر دیے جاؤ گے۔

ہم نے کہا "چھوٹے صاحب ویسے ہی تم پر رُعب جما رہے ہوں گے، بہر حال اتنا سا رُعب جمانا اُن کا حق ہے۔ تم بے فکر رہو تبادلہ منسوخ ہو جائے گا، بلکہ سمجھ لو کہ منسوخ ہو گیا!"

ہم دوبارہ افسرانِ بالا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے پھر یقین دلایا کہ تبادلہ ضرور منسوخ ہو جائے گا، لیکن عملاً پرنالہ وہیں تھا۔ قصّہ دراصل یہ تھا کہ سب سے چھوٹے صاحب یہ تبادلہ منسوخ کرنا نہیں چاہتے تھے اور دفتر کے اصل افسر وہی تھے، لہٰذا دونوں بڑے صاحب ہم سے وعدہ کرنے کے باوجود کچھ نہ کر سکے، اور ہم اپنا سا منہ لے کر گھر لوٹ آئے۔ ہمیں اس معاملے میں سب سے زیادہ بے عزّتی کا احساس دو طرح سے ہوا۔ ایک تو ہم نے غریب اہل کار کو بہت اعتماد کے ساتھ کہا تھا کہ تبادلہ منسوخ ہو جائے گا۔ دوسرے ہمیں بڑے صاحبان نے بار بار کہا کہ ہم سب سے چھوٹے صاحب کے پاس جا کر التجا کریں۔ ہم نے حکم کی تعمیل کی، لیکن اپنے طور پر سخت حیران تھے کہ جب وہ خود اعلیٰ

افسر ہیں، تو ہمیں اس چھوٹے افسر کے پاس کیوں بھیج رہے ہیں؟ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا، ہمارے دفتروں کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ بڑے افسر چھوٹے افسروں کے کاندھوں پر رکھ کر بندوق چلاتے ہیں اور پھر عذر یہ پیش کیا جاتا ہے یہ سب کچھ رواداری اور مساوات کے تحت کیا جارہا ہے، چنانچہ بڑے افسر کوئی حکم چھوٹے افسر کی صلاح کے بغیر صادر نہیں فرماتے۔ اِلّا یہ کہ بڑے افسر صاحب خود کسی معاملے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ ہم صلاح مشورے کو بُری چیز نہیں سمجھتے، لیکن بلاضرورت صلاح مشورے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب کو اپنے پر اعتماد نہیں۔

ہم تو صبح و شام اللہ میاں سے یہی دعا مانگتے ہیں کہ اے باری تعالیٰ ہمیں کسی افسر کے پاس کسی کام سے نہ بھیجنا۔ ہمارے افسر اپنی ذمہ داریوں سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا کام سے ڈرتے ہیں۔ عموماً اُن کی توقع اپنے عوام سے یہی ہوتی ہے کہ وہ ان کے پاس سلام کے لئے ضرور حاضر ہوں، لیکن کوئی کام لے کر نہ آئیں، چنانچہ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا، افسر صاحبان اکثر شاکی رہتے ہیں کہ ان کے پاس جو کوئی بھی آتا ہے، کام لے کر آتا ہے، گویا ساری قوم خود غرض بن گئی ہے۔ ہم کسی دوسرے سے کیا شکایت کر سکتے ہیں خود ہمارے دوست ہمیں اسی انداز سے گلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

ایک دفعہ ہمارے ایک دوست وزیر بن گئے، وہ جب بھی اپنے کسی ملاقاتی سے ہمارا تعارف کراتے یہی کہتے: "ان سے ملئے یہ ہمارے نہایت عزیز دوست ہیں اور نہایت مخلص بھی کیونکہ یہ واحد آدمی ہیں جو ہم سے کام کے بغیر ملتے ہیں۔"

ہم دل میں بہت شرمندہ ہوتے، آخر ہم بھی آدم زاد ہیں، ہمیں بھی کچھ نہ کچھ کام پڑ سکتا ہے، لہٰذا جب بھی ہمیں کوئی کام پڑتا ہم اس کا اظہار اس طرح کرتے جیسے ہم سے کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہوگیا ہے اور ہم اس کا اقبال کر رہے ہیں ـــــ

اسی طرح ایک دفعہ ہم ایک ضروری کام سے اپنے ایک افسر دوست کے پاس اڑھائی سو میل دور چل کر پہنچے، جیسے ہی ہماری آمد کی اطلاع پائی ہمیں فوراً شرف باریابی بخشا اور بغل گیر ہو کر کہا "شکر ہے بھائی کسی ایسے آدمی کی صورت بھی نظر آئی جو کسی کام کے بغیر ہمارے پاس آیا!"

اب بتائیے، اپنی شان میں کہے ہوئے اس عظیم فقرے کے بعد ہم کس طرح اپنا وہ کام ظاہر کر سکتے تھے، چنانچہ گپ شپ لگا کر واپس آ گئے۔

ہمارے اعلیٰ افسروں کا رویّہ ایسا کیوں ہے؟ آخر بات وہیں آکر ٹھہرتی ہے کہ عام طور پر یہ لوگ افسر نہیں ہوتے۔ افسر اور ہی کوئی ہوتا ہے؟ اگر آپ اصل افسر کے پاس پہنچ جائیں تو وہ آپ کی بات بھی سنتا ہے (اب خواہ اس کے سننے کا انداز کسی طرح کا ہو اور آپ کو کتنا ہی مہنگا کیوں نہ پڑے) وہ آپ سے گپ شپ کی نہیں، بلکہ اصل کام کی توقع رکھتا ہے۔ اصل کام ہی کی بات بھی کرتا ہے۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ دفتر میں جب کوئی آتا ہے، تو کام لے کر آتا ہے، لہٰذا کام لانے والے حضرات سے ناراض ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہیئے، چنانچہ وہ بظاہر نہیں، تو دل میں ضرور خوش ہوتا ہے۔ اس خوشی کا اظہار اس کے ایک لفظ سے ہو جاتا ہے۔ آپ کو آتا دیکھ کر وہ فوراً اپنے پاس بیٹھے ہوئے ساتھی سے کہے گا:

"لے یار، تیرا یہاں موجود ہونا بڑا مبارک ہے، کوئی موٹی اسامی آرہی ہے"!

دفتر کا اصلی افسر پبلک کے آدمی کو اسامی کہہ کر پکارتا ہے۔ لفظِ اسامی میں اصل افسر کی ساری شخصیت اور ہمارے دفتروں کا سارا معیار پوشیدہ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصلی افسر کی پہچان کیا ہے اور اس کا کھوج کس طرح لگایا جا سکتا ہے؟ اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ اصلی افسر اپنے سے اعلیٰ افسروں کے سامنے ہمیشہ بھیگی بلی بنا رہتا ہے ان کی ہر غلط یا صحیح بات پر ہاں میں ہاں ملاتا ہے، ان سے بڑے احترام سے پیش آتا ہے: جی حضوری اس کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔ اس کے اس رویّے سے بڑے افسر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑا فرمانبردار ہے، لہٰذا وہ اس پر اس حد تک اعتماد کرتے ہیں کہ اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کرتے۔ اب آپ ہزار چیخ پکار کرتے رہیں، افسرانِ اعلیٰ آپ کی بات کا ذرہ برابر یقین نہیں کریں گے، بلکہ اُلٹا آپ کو ناسمجھ قرار دیں گے۔ اصلی افسر اپنے اعلیٰ افسروں کے سامنے تو اس طرح پیش آتا ہے، لیکن جب اس کا سامنا پبلک سے ہوتا ہے، تو سیدھے منہ بات نہیں کرتا، اپنے ماتحتوں کو بُری طرح تنگ کرتا ہے،

عوام کو حقارت سے دیکھتا ہے، من مانی کرتا ہے۔ اب چونکہ وہ دفتر کا افسر ہوتا ہے اس لئے کوئی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کسی دفتر کا اصلی افسر ایک معمولی اہل کار بھی ہو سکتا ہے اور بڑے صاحب کا ڈپٹی بھی ـــــ

ہمارے ایک دوست کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ بعض دفتروں میں تو چپڑاسی اور ڈرائیور اصلی افسر ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں یہ مبالغہ ہے۔ ہمیں تو عموماً ریڈر اور پیش کار قسم کے اہل کار افسری کرتے نظر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دفتر میں سب سے زیادہ جس کا احترام کرتے ہیں اور جس سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں، وہ ریڈر یا پیش کار ہے۔ ہم صاحب لوگوں سے بالکل نہیں ڈرتے، یہ حضرات تو عموماً مٹی کے مادھو ہوتے ہیں، یہ آپ کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ سنوارنے کی ان سے توقع بالکل بے کار ہے۔ اگر یہ کچھ سنوار بھی دیں، تو ان کے دفتر کے اصلی افسر صاحب اسے نہایت آسانی سے بگاڑ سکتے ہیں۔ یہ ہم نے اپنا تجربہ بیان کیا ہے۔ آپ کو دفتر کا اصلی افسر کوئی اور ہستی نظر آتی ہے تو بہت ممکن ہے ہم غلطی پر ہوں، آپ ہماری اصلاح فرما سکتے ہیں۔

میں ایک مظلوم ہوں

"بس اللہ کا شکر ہے، لیکن تمہاری بلا سے"۔

"کیوں؟"

"ایمان سے کہو۔ تم نے کبھی یہ سوچا مجھ پر کیا گزر رہی ہے؟"

"خیریت ہے؟ بظاہر تو کوئی بات نظر نہیں آتی"۔

"ٹھیک، تم یہی کہو گے"۔

"یار حاجی صاحب، منہ سے کچھ بولو گے بھی یا خواہ مخواہ شکایت کرتے رہو گے"۔

جب اس نے یہ الزام لگایا کہ میں خواہ مخواہ شکایت کر رہا ہوں، تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ فون پر کھل کر بات نہ ہو سکتی تھی، چنانچہ دفتر کے بعد وہ میرے گھر آگیا۔ میں نے تفصیل سے اپنے زخم دکھانے شروع کئے:

غضب خدا کا میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ دو سال پہلے ہی ریٹائر ہو گیا ہوتا، لیکن برا ہو میرے اس جذبۂ خدمت کا کہ اس سے مجبور ہو کر ملازمت کی مدت میں توسیع کرانی پڑی۔ لوگ حالات سے تنگ آ کر ملازمت میں توسیع کراتے ہیں اور میں نے خالصۃً کام کرنے کی غرض سے ایسا کیا۔ حالات سے مجبور ہونا تو میں نے سیکھا ہی نہیں۔ کھانے کو نہیں ملتا نہ ملے، اوّل تو آدمی اتنا ناعاقبت اندیش ہی کیوں ہو جائے کہ ریٹائر ہوتے وقت قلّاش بنا بیٹھا ہو۔ ہاتھ تنگ ہو جاتے تو میں پریشان نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر کسی زمانے میں ہر موسم پر چار پانچ سوٹ سلواتا تھا، اب اگر ایک یا دو سے زیادہ کی نوبت نہیں آتی تو رونے

نہیں بیٹھتا، پھر بھی خوش رہتا ہوں۔ انسان کو ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔"

میری توسیعِ ملازمت کی بات سن کر وہ ہنس دیا اور کہنے لگا:

"خدا کے لئے حاجی صاحب، جھوٹ نہ بولو۔ میں نے تو سُنا ہے کہ تم نے توسیع کے لئے بڑے پاپڑ بیلے۔"

"اب بتائیے اس کا کیا علاج کہ لوگ اپنی طرف سے باتیں بنا لیتے ہیں۔ میں نے کچھ بھی نہیں کیا، صرف اپنے افسران کے حق میں خیر کے چند کلمات زبان سے ادا کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کلماتِ خیر کو نادان لوگ خوشامد کا نام دیتے ہیں۔ کلماتِ خیر میں بڑی برکت ہے۔ اسی برکت کا نتیجہ ہے کہ میں چار سال سے ایسی جگہ کام کر رہا ہوں جس کا مجھے ذرا بھی تجربہ نہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ افسران نے دورے پر کوئی بات پوچھی اور میں اس کا صحیح جواب نہ دے سکا، لیکن چونکہ مجھے کلمۂ خیر دم کرنا آتا تھا، اس لئے تھوڑی دیر بعد ہی افسر کا غصہ کافور ہو جاتا۔

پچھلے سال ہی کا ذکر ہے، ایک افسر نے اسی طرح مجھ سے کچھ پوچھا۔ مجھ سے جواب بن نہ پڑا، تو وہ میرے درپے ہو گیا۔ کہنے لگا:

"حاجی صاحب، بہتر یہ ہے کہ آپ عزت کے ساتھ ملازمت چھوڑ کر چلے جائیں، ورنہ میں آپکو یہاں نہیں رہنے دوں گا۔"

میں نے سوچا لو بھئی، اس دفعہ مارے گئے، لیکن جب دو چار بار دفتر میں جا کر اسے جھک کر سلام کیا اور تعریف کے چند جملے کہے، تو سال کے آخر میں اُس نے میری سفارش ایسے پر زور الفاظ میں کی کہ بس لطف آ گیا۔ میں سمجھتا ہوں چھوٹی سطح پر الفاظ اتنا کام نہیں کرتے جتنا کہ بڑی سطح پر ان کے ذریعے کام نکالا جا سکتا ہے ——— چھوٹی سطح پر الفاظ کے بجائے کچھ اور چیز چلتی ہے۔

بہر حال میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ کام کو عبادت سمجھتا ہوں، اسی لئے اپنی طاقت اور ہمت سے بڑھ کر دو سال کام کرتا رہا۔ اب ملازمت سے سبکدوش ہونا لازمی ہے۔ ویسے ایک کرم فرما کہہ رہے تھے کہ حاجی صاحب شاید ایک سال مزید کسی دوسری جگہ کام کرنے کا موقع مل جائے ———

لیکن آخر کب تک ؟ ملازمت سے ایک نہ ایک دن فارغ ہونا ہی پڑے گا۔

اس وقت میری ماہانہ آمدنی مشکل سے دو ہزار سے کچھ زیادہ بنتی ہے۔ آپ خود ہی سوچیے اس میں گھر کا خرچ پورا نہیں ہوتا۔ جب آمدنی نصف سے بھی کم رہ جائے گی، پھر کیا ہوگا؟ یہ ٹھیک ہے کہ میں اپنی طبیعت پر قابو پا سکتا ہوں، دو وقت کے بجائے ایک وقت مرغ کی یخنی پی لیا کروں گا لیکن بیوی اور بچوں نے کیا گناہ کیا ہے آن پر اس قسم کا ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے زندگی میں بہت کچھ کما کھا لیا، بچوں کے تو یہی دن عیش کرنے کے ہیں، پھر اولاد سے زیادہ مجھے اپنی بیوی کا خیال آتا ہے۔

اس غریب پر میرے ہاتھوں کیا کیا ظلم نہیں ہوئے۔ میں نے اپنی جوانی کے دنوں میں کبھی اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ اس کے شب و روز کیسے گزرتے تھے؟ تنہائی سے گھبرا کر وہ کیا کرتی تھی؟ کس طرح رہتی تھی؟ کب گھر سے جاتی تھی؟ کب گھر آتی تھی؟ مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ میں عموماً کلب سے دیر میں آیا کرتا تھا ایک رات ذرا پہلے آ گیا، دوسری سمت سے بھی ایک گاڑی آ گئی۔ اس میں سے میری بیوی باہر نکلی۔ گاڑی ٹھہرے بغیر فوراً ہی تیزی سے چلی گئی۔ میں نے پوچھا: اس وقت کہاں سے آ رہی ہو؟ اس نے کہا:
"تمہاری تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی کہ ایک صاحب کو میری حالت پر رحم آیا اور مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر یہاں چھوڑ گئے۔ بے چارے جلدی میں تھے، ورنہ میرا خیال تھا انہیں تم سے ملواتی اور شکریے کے طور پر کچھ چائے وغیرہ کو بھی پوچھتی۔"

اس رات میں اپنی غفلت شعاری پر بہت دیر تک افسوس کرتا رہا۔ میری بیوی اتنی اچھی ہے کہ اس نے پھر بھی کوئی شکایت نہیں کی۔ معلوم نہیں وہ غریب کتنی بار اس طرح مجھے راتوں کو ڈھونڈتی پھری ہوگی، بہر حال اب جی چاہتا ہے کہ اُسے میری طرف سے شکایت کا موقع نہ ملے۔ میں اُسے اچھے سے اچھا کھانا کھلانا اور پہنانا چاہتا ہوں۔ میری اس توجہ سے بیگم کچھ پریشان سی دکھائی دیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کی پریشانی کا سبب کیا ہے؟ وہ سوچتی ہے کہ اس کا خیال رکھنے سے جو معمولی سی ذہنی تکلیف مجھے ہوتی ہے، وہ بھی نہ ہو۔

"آپ جانتے ہیں میرے چار بچے ہیں۔ ابھی تک ان سب کی ذمہ داریاں میرے ہی ناتواں کندھوں

پر ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے بڑے لڑکے نے پچھلے سے پچھلے سال ہی مقابلے کا امتحان پاس کر لیا تھا اور اب وہ تربیت ختم کر کے ایک جگہ تعینات ہو چکا ہے، لیکن آپ کو معلوم ہے آج کل چار پانچ سو روپے ماہوار میں کب گزارا ہوتا ہے۔ اسے ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم بھیجنا پڑتی ہے۔ اس کے کپڑے بھی میرے ذمے ہیں۔ اس کے ایک نوکر کی تنخواہ بھی میں ہی دیتا ہوں۔ حالانکہ اسے ہزار بار سمجھایا کہ میاں! افسروں کو اپنی جیب سے خرچ کر کے ملازم رکھنے کی ضرورت نہیں، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ وہ کہتا ہے :۔

"ڈیڈی، ایسا کام ابتدائے ملازمت میں نہیں کرنا چاہیے۔ اپنی ساکھ بنانے کے لئے کچھ دیر نقصان بھی اٹھانا پڑے، تو کوئی مضائقہ نہیں"۔

"حال ہی میں بڑی بیٹی کی شادی سے فارغ ہوا ہوں۔ مجھے اس شادی کی بہت فکر تھی اور میرا پریشان ہونا جائز بھی تھا۔ گھر میں پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ سوچتا تھا کیا بنے گا، لیکن اللہ کریم مجھ ایسے غریبوں کی بھی سننے والا ہے۔ آپ کو معلوم ہے میں رشوت کا بالکل قائل نہیں ہوں، اس لئے میرے ماتحت مجھ سے ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ اب جو یہ شادی کا موقع آیا، تو ان میں سے ایک نے کہا :

"جناب، آپ کی بیٹی ہماری بیٹی ہے، ہمیں بھی اس تقریب سعید میں کچھ ہاتھ بٹانے کا موقع دیا جائے"۔

میرے بہت انکار کے باوجود ان لوگوں نے بیٹی کے لئے پچاس ہزار روپے کا انتظام کر ہی ڈالا۔ باقی پچاس ہزار میرے ایک پرانے ٹھیکیدار دوست نے مجھ سے چھپا کر میری بیوی کو بھجوا دیئے اور اس طرح مجھے اپنی غریب بیٹی کے اس اہم فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک لاکھ کی حقیر رقم ہی میں سارا کام کرنا پڑا، لیکن میرا داماد ایک بڑے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، اس کی نظر میں یہ سب کچھ ذرا نہ جچا۔ میں اسے حق بجانب سمجھتا ہوں اور اس وجہ سے میری یہ بیٹی زیادہ عرصہ میرے گھر ہی رہتی ہے۔

"باقی دو بچے ابھی تعلیم پا رہے ہیں۔ آپ تعلیم کے معاملے میں مجھے فضول خرچ کہہ سکتے ہیں، لیکن میرا عقیدہ ہے کہ بچوں کی تعلیم پر والدین کو دل کھول کر پیسہ خرچ کرنا چاہیے؛ چنانچہ میں نے ا؛

بچوں کو ملک کے سب سے اونچے ادارے میں داخل کرایا ہے۔ ہر ماہ ان پر بھی بہت کچھ خرچ ہو جاتا ہے۔

"ان اخراجات کے علاوہ ایک خرچ جو مجھے سب سے زیادہ تکلیف دیتا ہے، وہ قرض کی ادائیگی ہے۔ میرے پاس سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی، بیوی نے کہا اور کچھ نہ ہو لیکن ایک چھوٹا سا مکان ضرور بنا لینا چاہیئے، میں نے ابتداء میں بیوی کی اس تجویز کی سخت مخالفت کی، لیکن وہ اپنی ضد پر اڑ گئی اور مجھے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا مگر اب سوال یہ تھا کہ مکان بنایا جائے تو کیسے؟ بڑی تگ و دو کے بعد ایک ہاؤسنگ سوسائٹی سے قرضہ ملا۔ قرض کا تو ایک روپیہ بھی بہت ہوتا ہے اور میں نے اکٹھی چالیس ہزار کی رقم سر پر چڑھا لی۔ سُود اس کے علاوہ تھا۔ افسوس یہ ہے کہ مجھے اس رقم کا کچھ زیادہ فائدہ نہ ہوا۔ مکان پر دو لاکھ کے قریب خرچ ہو گئے اور پھر بھی وہ ایک شریف آدمی کی رہائش کے قابل نہ بن سکا۔ میں تو جب اپنے اردگرد کے مکان دیکھتا ہوں، تو شرم کے مارے گردن نہیں اٹھا سکتا۔ بہرحال پھر بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔

شکرگزاری کے لئے سکون اور اطمینانِ قلب کی سخت ضرورت ہے۔ میں حتی الوسع کوشش کرتا ہوں کہ میرے سکون و قلب کو مطلقاً آنچ نہ آنے پائے، لیکن بُرا ہو انسانی عقل کا کہ یہ خواہ مخواہ کسی بڑی پریشانی کا سبب بن جاتی ہے۔ میرے ماتحت عملے میں ایک صاحب کچھ زیادہ ہی دیانت دار مشہور ہیں انہوں نے پچھلے سال ایک چیز دو لاکھ میں تیار کرا دی۔ بلاشبہ یہ چیز بڑی مضبوط اور پائیدار بنی تھی۔ لیکن کام میں صرف اس چیز کا خیال نہیں رکھا جاتا، کام کرنے والوں کو بھی دیکھا جاتا ہے۔ ان کا خیال رکھنا مقدّم ہے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس چیز کے بنانے والے کو کچھ فائدہ نہیں ہوا، تو میرے اضطراب کی انتہا نہ رہی۔ میں اپنے آپ کو مطعون کرتا رہا کہ افسوس میری موجودگی میں میرے کام کرنے والے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ چیز کوئی معنی نہیں رکھتی، انسان معنی رکھتا ہے۔ آج اگر کوئی چیز ناقص بن گئی ہے، تو کل اُسے دوبارہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔ انسان کو ایک دفعہ نقصان پہنچ گیا، تو پھر اس کا ازالہ کرنا آسان نہیں، چنانچہ میں نے اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لیا جب تک اسی قسم کی چیز اپنے اُسی بنانے

والے سے دوسری جگہ آٹھ لاکھ میں نہ بنوالی ۔ گویا دو لاکھ کی چیز آٹھ لاکھ میں بنوا کر میں نے بنانے والے کو چھ لاکھ کا فائدہ پہنچایا ۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں رشوت سے مجھے پیدائشی نفرت ہے ۔ میں نذرانے اور تحفے تحائف وغیرہ قسم کی الا بلا قبول کر سکتا ہوں، لیکن رشوت قبول نہیں کر سکتا چنانچہ نذرانے کے طور پر ان چھ لاکھ میں سے تین لاکھ مجھے بھی دیے گئے ۔ یقین کیجئے ان تین لاکھ کو حاصل کر کے مجھے ذرہ برابر خوشی نہیں ہوئی ۔ جب بیوی نے دیکھا کہ میں بہت پریشان ہو رہا ہوں، تو اس نے اس رقم کو میری آنکھوں کے سامنے سے دور کرنے کے لئے فوراً اپنے بھائی کے نام بینک میں داخل کرا دیا۔"

میں نے جب دیکھا کہ میری یہ داستانِ زار سنتے سنتے میرا دوست اونگھنے لگا ہے، تو اسے جھنجھوڑ کر کہا:

"یار میں اپنا دکھڑا رو رہا ہوں اور تم اونگھ رہے ہو۔"

اس نے غنودگی کے عالم میں جواب دیا:

"نہیں حاجی صاحب، میں اونگھ نہیں رہا، بلکہ جھوم رہا ہوں۔"

"یہ جھومنے کا کون سا موقع ہے؟"

"معاف کرو پیارے، میں تمہاری ساری رُوداد کا مفہوم سمجھ چکا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"ذرا بتاؤ تو سہی، کیا مفہوم سمجھا ہے؟"

"تمہاری تمام رام کہانی کا لبِ لباب یہ ہے کہ تم سخت مصیبت میں مبتلا ہو اور جس طرح بھی بن پڑے، مجھے تمہاری مدد کرنی چاہیئے ۔ اب بلا تکلف بتاؤ کہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

میری طبیعت میں بلا کی خودداری پائی جاتی ہے، لیکن اس وقت میں نے سارے تکلفات بالائے طاق رکھ دیئے اور اس سے صاف صاف کہا کہ وہ مجھے اپنے ضلع میں کچھ مربعے الاٹ کرا دے ۔ وہ بولا: "لیکن یار حاجی، ایک دفعہ تم نے خود ذکر کیا تھا بارہ چودہ مربعے زمین تو پہلے ہی کہیں سندھ میں الاٹ کرا رکھی ہے۔"

"اس زمین پر خاک ڈالو، وہاں سے کچھ وصول نہیں ہوتا۔ پہلے تو میں نے وہاں کے اصل مزارعوں کو بے دخل کرانے میں وقت ضائع کیا۔ جب وہ بے دخل ہو گئے اور یہاں سے لے جا کر اپنے مزارع بٹھائے، تو اب وہی زمین کے خصم بنے ہوئے ہیں۔ جتنا کچھ اُن کا جی چاہتا ہے مجھے دے ڈالتے ہیں اور وہ بھی اس طرح جیسے میں اُن سے کوئی بھیک مانگ رہا ہوں۔"

دوست نے کہا "لیکن کیا زمین الاٹ کرانے کا تمہارا کوئی حق بنتا ہے۔ میرا مطلب ہے کیا ابھی تمہارے پاس کچھ یونٹ بقایا پڑے ہیں؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا:

"دیکھو، میں اور تم ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں ہمیں میرے تمام حالات معلوم ہیں اور مجھے تمہارے حالات سے پوری پوری واقفیت ہے۔ انصاف سے کہو کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کے نام ایک مرلہ زمین بھی نہیں تھی۔ بھائی جس طرح تم یونٹ خرید کر صاحب جائداد بن گئے اسی طرح میں نے بھی کچھ یونٹوں کا انتظام کر لیا ہے۔"

اس جواب پر میرا دوست ایک دم چونک کر کھڑا ہو گیا اور رخصت ہوتے ہوئے کہنے لگا:

"حاجی صاحب، میں نے تو تم سے یونہی پوچھا تھا۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ تم اپنے اور میرے پچھلے حسب نسب کو دہرانا شروع کر دو۔ تم ضلع میں یونٹ بھجواؤ، زمین الاٹ ہو جائے گی۔"

وعدہ تو میرے اس دوست نے بڑے زور شور سے کیا ہے۔ اب دیکھتا ہوں وہ میرے حال پر صحیح معنوں میں کرم کرتا ہے یا نہیں ۔۔۔ میرا فرض اس کو اپنی قابلِ رحم حالت سے آگاہ کرنا تھا، سو وہ کر چکا ہوں۔ خدا اس کے دل میں میرے لئے کوئی جگہ بنا دے اور مجھے اپنے ان کڑے حالات سے مردانہ وار گزر جانے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ ایک مردِ مسلمان کا سب سے بڑا بھروسہ تو اللہ کی ذات ہی پر ہے اور وہی مظلوموں کی دادرسی کرتا ہے۔

نام کی تختی

م۔ح سے ہماری خاصی پرانی دوستی ہے۔ پچھلے دنوں انہوں نے اپنا مکان بنوایا۔ تو ہمیں اس کی افتتاحی تقریب میں مدعو کیا۔ ہم اُن کے دیئے ہوئے پتے پر مکان تلاش کرتے رہے، لیکن کافی دیر تک کوئی سراغ نہ لگا سکے۔ انہوں نے بتایا تھا چوبُرجی سے پونچھ روڈ پر آنکھیں بند کر کے سیدھے چل پڑنا۔ سڑک ختم ہو جائے تو بائیں طرف ہو لینا۔ اس کے بعد پہلے چوراہے سے پھر بائیں سڑک پر آجانا۔ کچھ سو قدم گن کر دائیں اور اس کے پچاس قدم کے بعد بائیں اور تیس قدم کے بعد پھر دائیں۔ دو مکان چھوڑ کر منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤ گے۔ ہم کئی بار دائیں بائیں اور پھر بائیں اور پھر دائیں ہوئے۔ قدم بھی گِنے، لیکن اس طرح کرنے سے ایک بار ہم ایک مُرغی خانے پر پہنچ گئے۔ دوسری بار ایک تکیے پر۔ جہاں بڑے زور سے قوالی ہو رہی تھی۔ مُرغی خانے والوں سے م۔ح کا نام پوچھا، تو صاحبِ خانہ نے ہمیں اس طرح گھورا جیسے ہم نے اُسے کوئی گالی دی ہے۔ کہنے لگا۔

"اس نام کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہتا۔"

تکیے والوں سے پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے پُوچھ ہی لیا۔ ایک ملنگ نے زور کا نعرۂ حیدری لگاتے ہوئے ہمیں بتایا "بابو ملنگوں کو خدا کے گھر کے سوا کسی کے گھر کا پتہ معلوم نہیں ہوتا۔"

ہم تھک ہار کر واپس جا رہے تھے کہ پیچھے سے ہمیں آواز آئی۔ مُڑ کر دیکھا تو م۔ح ہمیں بُلا رہے تھے۔ ہم نے پوچھا بھلے آدمی مکان تلاش کرتے کرتے دو ڈھائی گھنٹے گزر گئے۔ کہاں ہے وہ تمہارا بنگلہ؟

ہمارے احتجاج کو سُنا اَن سُنا کر کے کہنے لگے : "میں نے بڑی وضاحت سے پتہ بتایا تھا۔

"جی ہاں! اُسی کے مطابق باقاعدہ قدم گن گن کر چلتا رہا ہوں' ایک دفعہ مرغی خانے کے سامنے جا پہنچا اور دوسری بار تکیے پہنچ گیا۔"

"تم نے قدم ٹھیک طرح نہیں لگائے۔ پھر بھی زیادہ غلطی نہیں ہوئی۔ مرغی خانے اور تکیے کے درمیان میرا مکان ہے۔"

"مگر یار نہ نہیں مرغی خانے والا جانتا ہے اور نہ یہ تکیے والا۔"

"عجب احمق ہو؟ بھلا مرغی خانے سے اور تکیے سے میرا کیا تعلق؟ نہ مجھے انڈے گوشت کا شوق ہے اور نہ میں بھنگ یا چرس پیتا ہوں۔"

"کم از کم اپنے گھر پر نام کی تختی ہی لگوا لیتے۔"

"لکھنے کے لئے دے رکھی ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔

تین چار ماہ بعد ہمیں پھر م۔ ح کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس دفعہ ہم پھر مکان تلاش کرتے پھرے۔ اُن کا گھر تو کیا ملتا تھا' نہ ہمیں وہ تکیہ نظر آیا اور نہ مرغی خانہ۔ بڑے پریشان' اُن کا نام پوچھتے ہیں تو کوئی خدا کا بندہ واقفیت کی حامی نہیں بھرتا۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس نام کا کوئی شخص اس محلے میں تو کیا اس کے آس پاس بھی نہیں رہتا۔ آخر اس دفعہ بھی ہم م۔ ح پر لعنت بھیج کر واپس جا رہے تھے کہ ہمیں وہ حضرت سامنے سے آتے نظر آئے' مکان پوچھا' تو کہنے لگے :

"بھئی میرے مکان کے سامنے ہی تو کھڑے ہو۔"

"اور وہ مرغی خانہ اور تکیہ کہاں غائب ہو گئے؟"

"رہائشی مکانات میں تبدیل ہو گئے۔ مطلب یہ ہے کہ مرغی خانے والے کی مرغیاں مر گئیں' اس نے وہ کاروبار چھوڑ کر مکان بنا لیا۔ تکیے میں جو قبر تھی' اسے کھودا گیا تو علم ہوا وہاں کوئی انسانی لاش دفن نہ تھی۔ محض چند نکھٹو لوگوں نے اپنے کھانے پینے کا دھندا چلا رکھا تھا' چنانچہ وہ زمین ایک صاحب کو الاٹ ہو گئی اور انہوں نے وہاں مکان تعمیر کر لیا۔

"مگر بھائی ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب پھر گذارش کر رہے ہیں کہ اپنے نام کی تختی کیوں نہیں لگوا لیتے"۔

"تمہارا خیال ہے میں اتنی سی بات نہیں جانتا"۔

"ضرور جانتے ہو گے، لیکن اپنے اس علم کو کام میں بھی تو لاؤ"۔

"اول تو ہر علم کو کام میں نہیں لایا جا سکتا اور اگر ایسا ممکن بھی ہو تو یہ لازم نہیں کہ جو علم تمہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے، میرے لئے بھی سود مند ثابت ہو"۔

"یار بالکل سیدھی سی بات کو گنجلک بنا رہے ہو"۔

"میں احوالِ واقعی کا اظہار کر رہا تھا تم اسے گنجلک کہتے ہو۔ ویسے تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہر سیدھی بات تجربے میں آ کر گنجلک بن جایا کرتی ہے"۔

"صاف صاف بتاؤ اپنے نام کی تختی لگا رہے ہو یا ہمیں اسی طرح حیران کرتے رہو گے"۔

"سچ پوچھو تو میں اس کا قائل ہی نہیں ہوں"۔

"کیوں؟"

"اس میں کچھ نمائش کی سی بُو آتی ہے"۔

"نام کی تختی لگانے میں؟"

"جی ہاں"۔

"بھلے آدمی، خالی نام لکھوانے میں نمائش کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے، البتہ اپنے نام کے ساتھ مڈل پاس وغیرہ قسم کی ڈگریوں کا ذکر بھی کرو گے، تو ضرور ایسا لگے گا"۔

"خالی نام کیا اور ڈگریوں سمیت کیا، مجھے تو دونوں صورتوں میں اوچھا پن نظر آتا ہے۔ بڑی بڑی کوٹھیوں میں صرف نام ہوتے ہیں اور ہم ایسے چھوٹے مکانوں والے اپنے نام کے ساتھ اپنی ذات، ڈگریوں، محکموں اور شہروں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اب اگر خالی نام لکھواتا ہوں، تو بڑے آدمیوں کی نقل معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے لوازمات کے ساتھ نام کا آنا ویسے ہی ذوقِ سلیم پر بار گزرتا ہے"۔

"معلوم ہونا چاہیئے نام کی تختی اپنے لئے نہیں، دوسروں کے لئے لگوائی جاتی ہے' اس لئے میرے بھائی اتم یہ زحمت ہماری خاطر گوارا کر لو۔ ہم جناب کے بیحد شکر گزار ہوں گے"!

"اچھا یار نام کی تختی لگوالوں گا کوئی اور بات کرو" م۔ ح نے یہ الفاظ کچھ اس طرح کہے جس سے ہم نے یہ سمجھا کہ وہ بازار جانے اور تختی لکھوانے میں کوئی تکلف محسوس کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا:

"میں تمہارے لئے نام کی تختی بنوا لاؤں گا اور تختی بھی کیا، سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے پر تمہارا نام لکھوا دوں گا"!

وہ ایک دم چونک کر بولا: خدا کے لئے ابھی سے سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر میرا نام لکھوانے کی زحمت نہ کرو۔ جو لوگ اس طرح نام کی تختی اپنے مکانوں پر لگواتے ہیں مجھے فوراً اپنی موت اور لوحِ مزار کا خیال آجاتا ہے۔

میں نے ہنس کر کہا: "تو پھر دیکھ لو، یا تو نام کی تختی لگواؤ، ورنہ میں سنگِ مرمر پر تمہارا لکھواتا ہوں"

اس نے جلدی سے جواب دیا: "ہاں ہاں، میں ایک دو دن ہی میں تختی لگوالوں گا"

اس واقعہ کے ہفتہ عشرہ بعد ہمارا گزر م۔ ح صاحب کے مکان کے سامنے سے ہوا، تو ہم کیا دیکھتے ہیں کہ واقعی ان کے نام کی تختی دروازے پر لگی ہوئی ہے۔ لیکن کوئی دو گھنٹہ کے بعد جب ہم واپس ان کے سامنے سے گزرے تو ہمیں یوں لگا جیسے وہ تختی غائب ہو چکی ہے۔ ہم نے سوچا ہمیں مغالطہ ہوا ہے اور ٹیکسی چونکہ تیز جا رہی تھی اس لئے ہم اچھی طرح تختی نہ دیکھ سکے۔

ایک ہفتہ بھی نہ گزرا ہو گا کہ ہمارا گزر پھر م۔ ح کے مکان کے سامنے سے ہوا۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ ہمارے ایک سسرالی عزیز نے م۔ ح کے مکان سے قریباً آدھ فرلانگ آگے ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا اور اب ہمیں ان سے ملنے کے لئے آنا ضروری تھا۔ اس دفعہ جو ہماری نظر م۔ ح کے دروازے پر پڑی تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ہمیں یوں لگا جیسے نام کی تختی پر خالی نام کے بجائے م۔ ح نالائق لکھا ہوا ہے۔ واپسی پر م۔ ح صاحب کے دروازے کی طرف دیکھنا یاد نہ رہا۔ کسی خیال میں گم گزرتے چلے گئے۔

اگلی اتوار دوبارہ جو اپنے اس عزیز کی مزاج پرسی کو آئے اور م۔ ح کے مکان کے سامنے سے تیزی میں گزرے تو یوں معلوم ہوا جیسے اس دفعہ تختی پر م۔ ح نالائق نہیں بلکہ م۔ ح بے وقوف لکھا ہوا ہے۔ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ ہم نے پہلے غلط پڑھا تھا یا اس بار ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ ویسے نالائق اور بے وقوف یہ دونوں لفظ ایسے نہیں ہیں جن کے پڑھنے میں کسی قسم کا مغالطہ سرزد ہو۔ ان ہردو الفاظ کی بناوٹ بالکل مختلف ہے۔ اگر نالائق کے بجائے ہم فائق پڑھ جاتے تو کوئی بات تھی۔ نالائق کو بے وقوف پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے دیکھنا تو گدھے کو، مگر سمجھنا یہ کہ کسی بطخ کو دیکھا ہے۔ ہم نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ واپسی پر ٹیکسی سے اتر کر م۔ ح صاحب کے نام کی تختی کا باقاعدہ معائنہ کیا جائے گا، چنانچہ جیسے ہی واپس ہوئے م۔ ح کے مکان کے سامنے ٹیکسی روک کر ہم اس میں سے اترے، قریب جا کر دیکھا، تو واقعی نام کی تختی پر م۔ ح بے وقوف لکھا ہوا تھا۔ گھنٹی بجائی تو اندر سے کوئی برآمد نہ ہوا۔ جالی کے کواڑ کھولے تو پتہ چلا کہ تالا لگا ہے۔ غالباً م۔ ح مع اپنے اہل وعیال کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔

تمام راستہ ہم سوچتے چلے گئے کہ آخر یہ کیا قصہ ہے۔ م۔ ح صاحب نے مزاحیہ شاعری شروع کر دی ہے اور بے وقوف تخلص رکھا ہے؟۔ لیکن اگر تخلص ہی رکھنے والی بات تھی تو نالائق تخلص کونسا برا تھا۔ پھر خیال آیا، ہوسکتا ہے نالائق کے بجائے بے وقوف اچھی طرح اشعار میں نظم ہوسکتا ہو۔ اگرچہ ہمیں اپنی یہ دلیل خود بھی کوئی زیادہ معقول نظر نہیں آرہی تھی۔ بہرحال ہم اس نتیجے پر ضرور پہنچ گئے کہ م۔ ح صاحب کے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آگیا ہے۔ بھلے چنگے آدمی کا یکایک شاعر بن جانا ہی کیا کوئی کم غیر معمولی واقعہ ہے۔

اس کے بعد ہم ایک ڈیڑھ ماہ کے لئے شہر سے باہر چلے گئے۔ واپسی ہوئی تو ہمیں پھر م۔ ح کے مکان کے سامنے سے گزر کر اپنے سسرالی عزیز کی مزاج پرسی کے لئے جانا تھا۔ م۔ ح کے مکان سے پہلے ایک چھوٹی سی مارکیٹ آتی ہے ہم ابھی اس مارکیٹ سے گزر ہی رہے تھے کہ ایک جگہ اپنے سسرالی عزیز کو کھڑے دیکھا۔ ہم نے ٹیکسی والے کو وہیں فارغ کر دیا۔ ہمارے اُن عزیز صاحب کے ساتھ چار پانچ اور اشخاص کھڑے تھے۔ علیک سلیک کے بعد پتہ چلا کہ کوئی صاحب م۔ ح کے مکان کا پتہ پوچھ رہے

ہیں اور وہاں کھڑے ہوئے افراد اُن صاحب سے باری باری کہہ رہے ہیں "کونسے م۔ح کو پُوچھ رہے ہو؟ م۔ح۔ نالائق؟ م۔ح بے وقوف؟ م۔ح چُغد؟ م۔ح اناڑی؟" قصہ دراصل یہ تھا کہ کسی صاحب نے م۔ح کے گھر پر م۔ح نالائق کے نام کی تختی دیکھی تھی، کسی نے م۔ح بیوقوف کے نام کی، کسی نے م۔ح اناڑی کے نام کی۔

میں نے اپنے سُسرالی عزیز سے کہا:

"یہ سب حضرات تو کبھی کبھی وہاں سے گزرتے ہوں گے۔ آپ تو ہر روز م۔ح کے مکان کے سامنے سے آتے جاتے ہیں۔ آپ بتائیے تختی پر اصل نام کیا لکھا ہُوا ہے؟" وہ قدرے حیرت اور مسکراہٹ کے ساتھ بولے "کیا عرض کروں۔" میں نے اسی ایک مکان پر ان تمام ناموں کی تختیاں لگی دیکھی ہیں۔ کبھی م۔ح نالائق، کبھی م۔ح چُغد، علیٰ ہٰذا القیاس۔" میں نے بات کو مختصر کرنے کے لئے اُن سے پوچھا: آج کل وہاں کس نام کی تختی لگی ہوئی ہے؟"

ہنس کر کہنے لگے: "آجکل تو کچھ عجیب قسم کا معاملہ ہے۔"

"کیا تختی کی جگہ کوئی سائن بورڈ آگیا ہے؟"

"نہیں یہ بات نہیں۔ ہے تو تختی ہی۔"

"پھر؟"

"اس پر نام کے بجائے کچھ اور عبارت تحریر ہے۔"

"م۔ح وہاں سے چلے گئے ہوں گے؟"

"یہ بات بھی نہیں، کل شام تو میں نے انہیں اس گھر سے نکلتے دیکھا ہے۔"

"پھر کیا لکھا ہے؟"

"تختی پر لکھا ہے یہاں ایک بہت بڑا الگدھا رہتا ہے۔ تمام لفظ چھوٹے ہیں لیکن گدھا جلی حروف میں تحریر ہے۔"

"یہ تختی کب سے لگی ہوئی ہے؟"

"بہت دنوں سے۔ غالباً یہ پہلی تختی ہے جو اس عبارت کے ساتھ اس مکان پر کچھ دیر سے قائم ہے۔ ورنہ ہوتا یہی رہا ہے کہ ایک دو دن کے بعد تختی بدلتی رہتی تھی۔"

جو صاحب م۔ ح کا پتہ پوچھ رہے تھے یہ گفتگو سن کر سمجھے کہ ہم اُن کا مذاق اڑا رہے ہیں، چنانچہ ناراض ہو کر چلے گئے۔ ہم نے انہیں بہت روکنا چاہا، مگر رُکے نہیں۔ ہم اپنے سسرالی عزیز کے ساتھ م۔ ح کے مکان پر پہنچے۔ دیکھا، واقعی تختی پر عجیب قسم کی عبارت لکھی ہوئی تھی۔ گھنٹی بجائی تو م۔ ح باہر آئے ہم نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا:

"حضرت! یہ کیا مذاق بنایا ہوا ہے۔"

"کون سا مذاق؟"

"اپنے نام کی تختی پر کیا لکھا ہے۔"

ایکدم ناراض ہو کر بولے: "تمہیں اُردو پڑھنا نہیں آتا؟"

"آتا ہے۔"

"پھر مجھ سے کیا پُوچھ رہے ہو؟"

"کچھ تو بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟"

"یہ الفاظ کیوں لکھے ہیں؟"

"اس لئے کہ میرے مکان پر یہی الفاظ مناسب ہیں۔"

"تب تو بہتر تھا کہ کوئی تختی نہ لگائی جاتی۔"

وہ پھر یکایک ناراض ہو کر بولے:

"یہ تم کہہ رہے ہو؟ شرم تو نہیں آتی تمہیں۔ میں تو خود تختی لگوانے کا قائل نہیں تھا۔ تم نے بار بار کہہ کر تختی لگوائی تھی۔ اب کہتے ہو تختی کی ضرورت نہیں۔"

"میں نے تو یہ کہا تھا کہ تم اپنے نام کی تختی لگواؤ۔"

"میرا یہی نام ہے۔"

"بھلے آدمی ناراض کیوں ہوتے ہو۔ صحیح بات تو بتاؤ۔"

"صحیح بات کسے کہتے ہیں؟"

"جو صحیح صورتحال کو واضح کردے۔"

"کیا یہ عبارت ایسا نہیں کرتی؟"

"ہرگز نہیں۔ اس میں لکھا ہے یہاں ایک بہت بڑا گدھا رہتا ہے، حالانکہ اس میں م۔ ح رہائش رکھتے ہیں۔"

"م۔ ح ایک بہت بڑا گدھا ہے۔"

"یہ تم طنزیہ انداز میں بات کررہے ہو۔ بارِ خدا کے لئے بتاؤ تو سہی کیا معاملہ ہے؟" ہمارے اس اصرار پر م۔ ح نے بتایا کہ جیسے ہی وہ اس مکان میں آیا تھا اُس نے اپنے نام کی ایک تختی دروازے پر حسبِ معمول لگادی تھی۔ دو تین روز بعد ہی کسی نے اس تختی کو اکھاڑ کر وہیں دروازے میں پھینک دیا۔ اس نے دوبارہ اس تختی کو دروازے پر آویزاں کیا۔ تین چار روز بعد پھر کسی نے اسے اکھاڑ پھینکا۔ اس نے پھر تختی لگادی۔ اسی طرح پانچ چھ بار کی حرکت کے بعد ایک دن تختی ہی غائب ہوگئی۔ م۔ ح نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا۔

ابتدا میں اس کا خیال تھا کوئی لڑکا یا بچہ یہ شرارت کررہا ہے، لیکن جب تختی بلند جگہ پر آویزاں کرنے کے باوجود گم ہوگئی، تو اس نے سوچا یہ کسی چھوٹے نہیں، بلکہ بڑے آدمی کی شرارت ہے۔ بہرحال تختی کے گم ہوجانے پر ایک طرح وہ مطمئن سا تھا کہ پھر ہم نے اصرار کرنا شروع کردیا۔ ہمارے کہنے پر اس نے ایک نئی تختی بنوائی، لیکن وہ اُسی دن سہ پہر کو غائب ہوگئی۔ اس پر اُس نے جل کر اپنے نام کے حروف کے ساتھ نالائق لکھ کر تختی لگوائی۔ ایک دو روز بعد اُسے بھی کسی نے غائب کردیا۔ پھر اس نے اناڑی، بے وقوف، احمق وغیرہ قسم کے صفات کے ساتھ کئی تختیاں آویزاں کیں اور ہر تختی گم ہوتی رہی۔ آخر کار اس نے یہ تختی لگوائی جس پر لکھا تھا:

"یہاں ایک بہت بڑا گدھا رہتا ہے۔"

ہم نے م۔ح سے اظہارِ ہمدردی فرماتے ہوئے عرض کیا "یہ تو بہت بری بات ہے آپ کو تفتیش کرنی چاہئے کہ یہ کون مسخرا ہے جو آپ ایسے شریف آدمی سے اس طرح کا نازیبا مذاق کر رہا ہے۔"

م۔ح مسکرا کر کہنے لگے "شروع شروع میں تو مجھے بھی بہت غصہ آیا تھا لیکن بعد میں غور کیا تو محسوس ہوا کہ اس قسم کی حرکت کرنے والا مسخرہ نہیں ہو سکتا، بلکہ کوئی بہت ہی سمجھدار آدمی معلوم ہوتا ہے۔ یارو سوچو تو سہی ہم میں انسانوں والی بات کون سی رہ گئی ہے جو ہم اپنے نام انسانوں ایسے رکھ کر خوش ہوں۔ کوئی میرا مشورہ مانے تو میں یہی کہوں گا ہمیں اپنے مکانوں پر اپنی اپنی عادات و خصائل کے مطابق تختیاں آویزاں کرنی چاہئیں۔ کسی مکان پر تختی لگی ہوئی ہو "یہاں ایک بھیڑیا رہتا ہے" کسی پر لکھا ہو "یہ ایک لالچی کتے کا مکان ہے" کسی دروازے پر تحریر ہو "اس میں ایک لومڑ آباد ہے" اسی طرح کسی بنگلے پر لکھا ہو "یہ سانپوں کا مسکن ہے" کہیں تختی نظر آئے "یہ ایک بہت بڑے خنزیر کی کوٹھی ہے" وغیرہ وغیرہ؟"

ہم نے کہا "لیکن بھائی م۔ح صاحب! کیا آپ کے لئے گدھے کا لفظ مناسب ہے؟"

وہ بولا "کیوں نہیں؟ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے آدمی کے لئے گدھے سے بہتر اور کوئی لفظ کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ میں سمجھتا ہوں اگر میرے لئے گدھے کا لفظ مناسب نہ ہوتا تو یہ تختی کبھی کی غائب ہو گئی ہوتی۔"

ہم ہی نہیں م۔ح کی باتیں سن کر ہمارے سسرالی عزیز بھی بہت متاثر ہوتے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی اپنی جانورانہ صفات کے مطابق اپنے اپنے مکانوں پر تختی آویزاں کرنے کی ہم میں اخلاقی جرأت موجود نہ ہو۔

خزانے کی تلاش

"یار دو! کیا فضول بحث چھیڑ رکھی ہے، اسے ختم کرو، مچھروں نے کاٹ کاٹ کر میرے تو ہاتھ پاؤں کا ستیاناس کر دیا۔" حامد کے اس احتجاج پر محفل میں جو گرما گرم گفتگو ہو رہی تھی، وہ ایک لمحے کے لئے رُک سی گئی۔ صادق نے ہنس کر کہا: "پیارے! مچھر تمہارے ہاتھ اور پاؤں کو کاٹ نہیں رہے ہیں، بلکہ وہ تمہارے ہاتھوں پر بیعت کرنا چاہتے ہیں، تم انہیں ایسا نہیں کرنے دیتے، اس لئے وہ تمہارے پاؤں پڑتے ہیں اور جب تم انہیں پاؤں بھی نہیں پڑنے دیتے تو وہ دوبارہ بیعت کے لئے تمہارے ہاتھوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔"

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور میرا بُرا حال ہوا جا رہا ہے۔"

"خوب! تم ہماری بات کو مذاق سمجھتے ہو اور جو مذاق تم ہم سے کر رہے ہو، اس پر غور نہیں کرتے۔"

"میں نے تم سے کون سا مذاق کیا ہے۔"

"قربان اس معصومیت پر، ہماری اس قدر سنجیدہ گفتگو کو فضول کہہ رہے ہو اور پھر پوچھتے ہو میں نے تم سے کون سا مذاق کیا ہے؟"

"تم لوگ یہی بات کر رہے تھے نا کہ ملک بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے؟"

"جی ہاں، یہی بات ہو رہی تھی۔"

"لیکن یارو! ملک نازک دور سے کب نہیں گزرا! میں تو یہ جانتا ہوں، جب سے ہمیں آزادی نصیب ہوئی ہے، اسی وقت سے یہ صدا مسلسل طور پر بلند ہے کہ ہم بڑے نازک دور

سے گزر رہے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے بھی تو یہ خوش آئند آواز کانوں میں نہیں آئی کہ اب حالات تسلّی بخش ہیں۔ ہمارے لئے تو ہر دَور نازک سے نازک تر بن کر آیا ہے۔ نزاکتِ حالات کی باتیں سُن سُن کر میرے تو کان پک گئے۔ خدا کے لئے کوئی اور بات کرو۔" حامد کے یہ جملے سُن کر ایک اور دوست بولا:

"بھائیو! قصّہ دراصل یہ ہے کہ حامد بہت دیر سے خاموش ہے، اب یہ بھی کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

"صادق نے فوراً بات کاٹی "میرے خیال میں حامد کا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ یہ بولا تو پھر پورا ہی تولے گا۔ ہمیں خواہ مخواہ کوئی نصیحت سننا پڑے گی۔"

"میں اور نصیحت؟" حامد نے ذرا تلخی سے کہا۔

"چلو نصیحت نہ سہی، اسے بور کرنے والی بات بھی کہا جا سکتا ہے؟"

"مثلاً میں تمہارے خیال میں اب کیا کہنے والا ہوں۔"

"تم اب یہی کہو گے کہ قومی زبان کا مسئلہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اسے قائدِ اعظمؒ نے ابتداء ہی میں حل کر دیا تھا۔ ہمارے پاس پہلے سے ایک ایسی زبان موجود ہے جو پاکستان کے گوشے گوشے میں سمجھی جاتی ہے۔ ہمیں اس رابطے اور اتحاد و اخوّت کی زبان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ ہم نے اس زبان کو ملک کے ایک حصّے کی زبان قرار دے کر کوئی عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ ہم نے اپنی سالمیّت کو بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ ہم وطن دشمن عناصر کے بھانسے میں آ گئے۔"

"میں اس وقت یہ بات بالکل نہیں کہنے والا تھا۔"

"کیا تم نے ہزاروں بار یہ بات نہیں کہی۔"

"ضرور کہی، لیکن اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس قسم کی باتیں نہیں کیا کروں گا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تم لوگ ذہنی طور پر اس قابل ہی نہیں کہ تم سے کوئی بنیادی اور اہم بات کہی جائے اور تم اسے سمجھ بوجھ کر اپنی زندگی میں شامل کر سکو۔" اس جملے پر سب نے ایک بار قہقہہ لگایا۔ صادق بولا: "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ تم نصیحت پر اتر آؤ گے۔"

"یہ نصیحت ہے؟ تم جانتے ہو نصیحت کسے کہتے ہیں؟"

"میں لفظی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ بہر حال تم جو کچھ کہنے والے ہو، مجھے معلوم ہے۔"

"پھر بتاتے کیوں نہیں، کیا کہنے والا ہوں؟"

"تم یہی کہنا چاہتے ہو کہ ہمیں اپنی آئیڈیالوجی پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ ہم اب تک جس منافقت اور ریاکاری کے ساتھ اپنی آئیڈیالوجی کا مذاق اڑاتے رہے ہیں، اس نے ہمیں تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔ جس قوم کی کوئی آئیڈیالوجی، کوئی نصب العین نہیں ہوتا، وہ قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"صادق تمہیں معلوم ہونا چاہیئے میرا اس قسم کی باتیں کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"پھر کیا ہوا، آئیڈیالوجی پر نہ سہی، قومی کردار پر بات کرنا چاہتے ہو گے۔ ابھی ابھی حکم صادر کرو گے۔ اے قوم کے نوجوانو، اپنے اندر قومی کردار پیدا کرو۔ قومی کردار ہی دراصل ترقی کا وہ زینہ ہے جو کسی قوم کو عروج پر لے جا سکتا ہے۔"

"تمہیں یہ سن کر افسوس ہو گا کہ میں قومی کردار پر بھی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔"

"پھر تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ تم تعلیم کا رونا لے بیٹھو گے اور موجودہ نظام تعلیم میں ہزاروں کیڑے ڈالو گے۔"

"پیارے یہ سب باتیں بے کار ہیں۔"

حامد کا یہ جملہ سن کر تمام دوستوں نے حیرت زدہ ہو کر ایک ساتھ پوچھا؟ یہ سب باتیں بیکار ہیں؟

"جی ہاں، قطعی بیکار ہیں۔ آئیڈیالوجی پر بحث کرنا فضول، قومی کردار پر باتیں کرنا بے معنی، نظام تعلیم پر غور و خوض کرنا لغو اور مہمل۔"

"اس کا مطلب ہے، تم ماشاء اللہ سمجھدار ہوتے جا رہے ہو۔" ایک نے طنز کے طور پر کہا۔

"میں سمجھدار کب نہیں تھا۔" حامد کے اس بے ساختہ جواب پر سب دوست ایک بار پھر ہنس دیے۔

شاہد بولا: بہر حال تم نے ہماری اتنی عمدہ بحث کے تسلسل کو توڑا ہے۔ اب بتاؤ کہ فی الواقع

تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تم لوگ اس قسم کی بحث میں پڑکر اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"بھئی کمال ہے، اب بھی اپنی اسی بات پر اڑے ہوئے ہو۔ ہم ملک کی سالمیت پر گفتگو کر رہے ہیں اور تم ہو کہ اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دے رہے۔"

"وہ اس لئے کہ ہماری اس قسم کی باتوں سے ملک کی سالمیت پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑے گا ملک کی سالمیت برقرار رہ سکتی ہے، البتہ اگر اسے کوئی چیز نقصان پہنچاتی ہے تو وہ ہماری یہ خالی خولی باتیں۔"

"مگر یار آج سے پہلے تو تم خود اس قسم کی بحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے رہے ہو؟"

"چلیے مان لیتا ہوں کہ میں غلطی پر تھا۔"

"تو پھر اب کون سی راہِ راست اختیار کی ہے؟"

"اُف یار! مار ڈالا۔"

"کیوں، خیریت تو ہے، کیا ہوا؟"

"مچھر بُری طرح کاٹ رہے ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے تم پر مچھروں کی خاص عنایت ہے۔"

"وہ اس وجہ سے کہ میں ایک عام آدمی ہوں اور مچھر عام آدمی کو کاٹتے ہیں۔ تم لوگ خواص میں سے ہو، تمہیں کاٹنے کی جرأت نہیں کرتے۔"

"اچھا بابا اسی طرح سہی۔ اب اپنی بات ختم کرتے ہو یا نہیں۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ تمہارے خیال میں اہم مسائل پر گفتگو کرنا تو بیکار سی بات ہو گئی ہے۔ پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

"کرنے کے لئے بہت سے کام ہیں۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"پہلا اور اہم کام تو یہی ہے کہ مچھروں کا خاتمہ کر ڈالو۔ مچھر ختم ہوئے تو بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔"

"گویا مچھر ہمارا اہم ترین قومی مسئلہ ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے؛ لیکن مشکل یہ ہے کہ بڑے آدمیوں کو عوام کے یہ چھوٹے چھوٹے مسائل نظر نہیں آتے۔ اگر عام آدمی کے ان معمولی معمولی مسائل کا خیال رکھا جائے، تو ملک کے بڑے بڑے مسائل خود بخود حل ہو جائیں، یا وہ مسائل پیدا ہی نہ ہوں۔"

"تم کہنا یہ چاہتے ہو کہ بڑے مسائل سے زیادہ اہمیت کے حامل چھوٹے مسائل ہوا کرتے ہیں؟"

"یقیناً۔ ایک تو چھوٹے مسائل نسبتاً آسانی کے ساتھ اور تھوڑے وقت میں حل کیے جا سکتے ہیں۔ دوسرے جب تک معمولی حیثیت کے مسائل حل نہیں ہو جاتے، قوم کے افراد میں بڑے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔"

"تمہارا مطلب ہے بڑے مسائل کی راہ میں چھوٹے چھوٹے مسائل ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں؟"

"بالکل تم خود سوچو، اگر عام آدمی رات کو مچھروں کی وجہ سے سو نہ سکے اور دن میں اسے مکھیوں کے باعث صاف ستھری غذا میسر نہ آئے، تو وہ کیسے کوئی کام خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دے سکتا ہے؟ اگر ہمیں ہر وقت یہی دھڑکا ہے کہ نامعلوم کس لمحے بجلی چلی جائے، کس پل نلکے کا پانی بند ہو جائے، تو پھر ہم کس طرح یکسوئی کے ساتھ کسی کام میں اپنی پوری قوت صرف کر سکتے ہیں۔ ہمیں گھنٹوں بس کے انتظار میں کھڑے رہنا پڑتا ہے۔ ہمارے بڑوں کو معلوم ہی نہیں ہے کہ بس کا سفر کیا معنی رکھتا ہے۔ اور تو اور خود ٹرانسپورٹ کے افسرانِ بالا کو اس کی خبر نہیں ہوتی کہ مسافروں پر ہر روز کیا گزرتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کبھی ٹرانسپورٹ کی انتظامیہ کے کسی اعلیٰ افسر نے یہ دیکھنے کے لیے کہ بس میں بیٹھنے والوں کا کیا حال ہوتا ہے، بذاتِ خود بس میں سفر کیا ہو۔ ہم لوگ شکائتیں سننے کے عادی ہیں، شکایتوں کو آنکھوں سے دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ ہمارے کارپردازانِ قوم

یہ نہیں جانتے کہ اگر ایک عام آدمی تاخیر سے اپنی منزل پر پہنچتا ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ صرف ایک آدمی تاخیر سے منزل پر پہنچا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پوری قوم کو اپنی منزل پر پہنچنے میں تاخیر ہو گئی ہے۔ ایک عام آدمی کا سفر پوری قوم کا سفر ہوتا ہے۔ عام آدمی کا راستے میں رُک جانا یا تھک کر بیٹھ جانا پوری قوم کے رُک جانے یا تھک کر بیٹھ جانے کے مترادف ہے۔ زندگی میں وقت کی جو اہمیت ہے، وہ ہم میں سے کسی سے پوشیدہ نہیں، لیکن چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے ہمارا کس قدر وقت صرف ہوتا ہے، اس پر شاید عوام تو کُڑھتے اور جلتے ہوں، لیکن خواص کو اس کی ذرا پروا نہیں۔ کلرک اگر کسی فائل کو دابے بیٹھا ہو تو اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ افسر صاحب اس فائل پر دستخط نہیں کرتے، تو ان سے باز پرس کرنے کی کس میں ہمت؟ جس شخص یا اشخاص سے فائل متعلق ہوتی ہے وہ پریشان ہوتے اور تڑپتے پھرتے ہیں۔ متعلقہ کلرک اور افسر یہ سمجھتے ہیں کہ اس فائل کا تعلق صرف ایک شخص یا چند اشخاص سے ہے اور اگر وہ پریشان ہوتے ہیں اور تڑپ رہے ہیں، تو کون سی قیامت آ جائے گی۔ حالانکہ اس پریشانی اور اضطراب میں پورا معاشرہ شامل ہوتا ہے اور خود وہ کلرک اور افسر بھی جس کی خبر انہیں ہوتی ضرور ہے، لیکن بہت دیر بعد۔" حامد نے ایک لمحہ رُک کر پھر بولنا شروع کر دیا۔ "اور تم لوگ جو ملکی سالمیت پر بڑے زور شور سے بحث کرتے ہو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر عام آدمی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھا جائے، تو اس کے دل میں اپنے ملک سے سچی محبت پیدا ہو گی۔ ملکی سالمیت کا راز عام آدمی کے دُکھ سُکھ میں پوشیدہ ہے۔ عام آدمی کی معمولی خوشیاں ملک بھر کو غیر معمولی خوشیوں سے ہمکنار کر سکتی ہیں۔ اتحاد، حبّ الوطنی اور سالمیت کے تمام تصوّرات عام آدمی کے گرد گھومتے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے نام نہاد لیڈر اوّل تو عام آدمی کی زندگی سے بے خبر رہے اور اگر انہیں کچھ خبر بھی ہوئی ہے، تو وہ اس خبر کو اپنی کامیابی کے لئے ایک سٹنٹ بنانے سے آگے نہیں بڑھے۔ اس قسم کے رہنماؤں کو فی الحقیقت عوام سے کوئی محبت نہیں ہوتی اور ...."

"بس جناب حامد صاحب! آپ نے کافی تقریر کر لی۔ جس چیز کا ہمیں ڈر تھا وہی ہوا۔ یار تم

تو ہمیں ایک بات بتانے چلے تھے اور نہ جانے جوش میں کیا کیا کہہ گئے۔"

"ایک بات پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ہاں ایک بات۔"

"بس تو ایک بات تو یہی ہے کہ مچھروں کو مار ڈالو، سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔"

"مچھر، مچھر... یہ کیا فضول رٹ لگا رکھی ہے۔"

"مچھر کے مسئلے کو فضول رٹ سمجھتے ہو؟ خدا کی قسم مچھر تو ہماری قومی غیرت کے منہ پر ایک بہت بڑا طمانچہ ہے۔ رات کو مچھر ہمارے کان میں آکر نہیں بولتا، بلکہ چھوٹے چھوٹے مسائل ہاتھیوں کی طرح چنگھاڑتے اور شیر کی طرح دھاڑتے دکھائی دیتے ہیں۔" حامد نے چنگھاڑنے اور دھاڑنے کے الفاظ اس زور سے ادا کئے کہ پاس بیٹھا ہوا شہزادہ کامران جو اس تمام گفتگو کے دوران سویا ہوا تھا۔ یکایک جاگ اُٹھا اور امریکی لہجے میں اُردو بولتے ہوئے کہنے لگا: "ڈیئر حامید! (حامد) یہ تم کیا ماشیر ماشیر (مچھر مچھر) کر رہے ہو۔ میں تمام دنیا گھوم کر آیا ہوں، مجھے اس میک کی گاڑی کہیں نظر نہیں آئی۔"

صادق نے مذاق میں کہا: "یہ خاص پاکستانی ساخت کی گاڑی ہے۔"

"مسٹر صادیک، تم ہم سے جوک کرتا ہے۔ پاکستان نے کون سی گاڑی بنائی ہے؟"

"نہیں شہزادہ صاحب! مچھر موٹر گاڑی نہیں، بلکہ ....." سلیم بات بھی پوری نہ کرنے پایا تھا کہ شہزادہ پھر بول پڑا:

"آئی سی ...... آئی سی۔ ماشیر کوئی ایکٹرس معلوم ہوتی ہے۔ غالباً فار ایسٹ کی کوئی حسینہ ہے۔"

شہزادے کے یہ ریمارک سُن کر سب دوست ہنس پڑے۔ اس نے ناراض ہو کر کہا:

"پارٹنر، فُول بنا رہے ہو؟"

سلیم پھر بولا: "شہزادے! مچھر نہ موٹر گاڑی ہے اور نہ کوئی حسینہ عالم اداکارہ، یہ تو ایک جانور ہے۔"

"کتنا دودھ دیتا ہے یہ جانور؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو یار شہزادے! مچھر اور دودھ؟"

"ٹھیک ..... ٹھیک ..... میں سمجھ گیا، یہ کوئی سواری کا جانور ہے۔"

"سنو پیارے! مچھر نہ دودھ دیتا ہے اور نہ سواری کا جانور ہے، بلکہ یہ تو انسان کا خون چوستا ہے

اور عین اس پر سوار ہو کر۔"

"تو پھر پارٹنر، سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم ماسکیٹو کی بات کر رہے ہو۔"

"شکر ہے تم نے بات سمجھ لی۔"

"لیکن مچھر کس زبان کا لفظ ہے؟"

"جو سارے پاکستان میں سمجھی جاتی ہے۔" سلیم کے اس جواب پر شہزادہ کامران نے ذرا شرمندہ ہو کر کہا:

"پارٹنر مجھے معاف کر دو۔ تم جانتے ہو ہمارے گھر میں انگریزی زیادہ بولی جاتی ہے۔ ڈیڈی خاص طور پر اصرار کرتے ہیں کہ انگریزی زبان بولا کرو۔ اس کے علاوہ یہاں میں نے جتنے عرصے تعلیم پائی، انگریزی سکولوں میں پڑھتا رہا۔ بعد میں باہر چلا گیا اور اب کئی برس کے بعد پاکستان آیا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" سلیم نے شہزادے کی معذرت کو قبول کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ حامد کیا کہہ رہا تھا؟" شہزادے نے پوچھا۔

"حامد کہہ رہا تھا کہ مچھروں کو مار ڈالو، سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔"

"مگر پارٹنر، مچھر ہیں کہاں؟"

"ہمارے ملک میں۔"

"یہ بالکل غلط ہے۔ ہمارا مکان گیارہ بارہ کنال کے ایریا میں بنا ہوا ہے۔ اس میں اچھے خاصے کھلے دو گھاس کے لان ہیں — اور صرف ہمارا مکان ہی نہیں، آس پاس کے تمام بنگلے اسی طرح کشادہ اور سر سبز ہیں، لیکن وہاں مچھر نام کو نظر نہیں آتا۔ تم لوگ خواہ مخواہ پاکستان کو بدنام کر رہے ہو۔ مچھر ہمارے ملک کا مسئلہ نہیں۔ تمارگا ڈیسک ایسے مسائل کا کیوں ذکر کرتے ہو جن کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔"

"تمہیں اب تک کسی مچھر نہیں کاٹا؟" صادق نے پوچھا۔

"ضرور کاٹا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں مچھر کا وجود مسٹر حامد کی بد مذاقی کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے اپنا مکان ایسی گندی جگہ کیوں بنایا جہاں مچھر کا ہونا لازمی بات ہے۔"

حامد نے جل کر کہا "یار شہزادے! لیڈر بن جاؤ، بڑے کامیاب رہو گے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ڈیڈی کا بھی یہی خیال ہے۔"

"ڈیڈی کا کیا خیال ہے؟" صادق نے پوچھا۔

"وہ کہتے ہیں، بیٹا! سیاست میں آجاؤ۔ اس میں بہت سکوپ ہے۔ سیاست ایک ایسا میدان ہے جس میں انسان سے غلطی بھی ہو جائے، تو وہ بھی اچھی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کے بھی ہزاروں معنی نکالے جا سکتے ہیں۔ معمولی معمولی باتوں کا تو ذکر ہی فضول ہے، بڑی سے بڑی غلطی حتیٰ کہ سیاست میں غداری بھی انسان کو عظیم لیڈر بنا دیتی ہے۔ بھولے بھالے عوام کو اپنے جذبات بہت عزیز ہوتے ہیں، کوئی بات ایسی کرو جو ان کے جذبات کو اپیل کرتی ہو، پھر تم فوراً قوم کے عظیم لیڈر بن جاؤ گے۔"

"اب جناب کے کیا ارادے ہیں؟" سب دوستوں نے پوچھا۔ شہزادے نے جواب دیا:

"میں لیڈر بن رہا ہوں۔ میں نے میکیاولی کی کتاب "شہزادہ" کا اچھی طرح مطالعہ کر لیا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے انسانی فطرت کیا ہے اور اُسے کس طرح قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔"

"تب تو یار! ہمیں تم سے بہت سی توقعات وابستہ رکھنی چاہییں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن حامد! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے میں تمہارے مچھروں کو مسئلہ نہیں بننے دوں گا۔ یہ تمہارا خود ساختہ مسئلہ ہے۔ گندی جگہ کیوں رہتے ہو، کسی صاف ستھری بستی میں مکان کیوں نہیں بنواتے؟ اسی طرح مجھے ان لوگوں پر بھی ہنسی آتی ہے جو آنے جانے کو مسئلہ بنائے ہوئے ہیں اور بسوں کی شکایت کرتے ہیں۔ آخر وہ موٹر کار کیوں نہیں خریدتے؟ بس میں سفر کیوں کرتے ہیں۔ لوگ بس میں سفر کرنا چھوڑ دیں گے، تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ محنت کریں، روپیہ کمائیں، پھر انہیں نہ کوئی مچھر کاٹے گا اور نہ کوئی مکھی تنگ

کرے گی، اسی طرح انہیں بس کا انتظار بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ دفتر میں جائیں گے، ان کی عزت ہوگی، دکان پر پہنچیں گے، انہیں اچھی سے اچھی چیز دستیاب ہوگی۔ معلوم نہیں ہمارے عوام کو کیا ہوگیا ہے کہ انھوں نے مکھی اور مچھر جیسی حقیر چیزوں کو مسئلہ بنایا ہوا ہے۔"

"شہزادے، ہمارے عوام تو بے وقوف ہیں۔ تم بڑے لیڈر بننے والے ہو۔ تمہارے خیال میں ہمارے ملک کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ کسی لیڈر یا قوم کے لئے اصل مسئلے کی تلاش خزانے کی تلاش ہے۔ یہ معلوم ہوجائے، تو قوم کے بگڑے نصیب سنور جاتے ہیں۔" صادق نے اپنے طنز کو سنجیدگی میں چھپاتے ہوئے شہزادہ کامران سے سوال کیا۔ کامران نے جواب دیا:۔

"ویسے تو میں ایک کامیاب لیڈر کے لئے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ عوام کو جس قدر بے وقوف بنائے، اتنا ہی کم ہے، لیکن میرے خیال میں عوام کو محض بے وقوف بنانے سے بھی قوم زیادہ ترقی نہیں کرسکتی۔ بے وقوفی کے ساتھ عوام کے ذوقِ آزادی اور ذوقِ جمال کو بھی تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ میں نے اپنے وطن میں آکر شدت سے محسوس کیا ہے کہ ہماری خواتین کا ذوقِ جمال نہایت غیر مہذب ہے، ان میں بلا کی شرم ہے۔ میں تو جس اچھی لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں، وہ شرما جاتی ہے۔ لیڈر بنتے ہی سب سے پہلے یہ کام کروں گا کہ ہماری عورتیں شرم و حیا کے چکر سے باہر نکلیں۔ اُف ظالم نے...... کھا لیا!"

سب دوستوں نے شہزادہ کامران کے اس طرح اچانک اُف کرنے پر پوچھا: پیارے خیریت تو ہے۔ اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے یہ تمہیں کیا ہوگیا؟" شہزادہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا: "اٹھو یارو! یہ تم لوگ کہاں بیٹھے ہوئے ہو۔ مچھروں نے مجھے تو قریب قریب حلال ہی کرڈالا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جہاں ہم لوگ بیٹھے ہیں یہ ہمارے پاک ملک کی سرزمین معلوم نہیں ہوتی، ہماری بستی میں آکر دیکھو، مجال ہے جو کہیں مکھی مچھر نظر آجائے اور اگر کوئی اکا دکا نظر بھی آئیگا تو اس میں اتنی ہمت نہیں ہوگی کہ وہ ڈنک مار سکے" شہزادے کے اٹھتے ہی محفل برخاست ہوگئی اور سب دوست چلے گئے۔ حامد اپنے گھر میں تنہا کھڑا سوچ رہا تھا، ہمارے ملک کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ مچھر یا عورت کی حیا؟ یا پھر کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اصل مسئلہ خزانے کی طرح ابھی تک چھپا ہوا ہے اور ہمیں اس کی تلاش کرنا باقی ہے؟

خوشی کا دن

"قاضی عبدالسلام ناچ رہے ہیں"

"قاضی عبدالسلام ناچ رہے ہیں۔" یہ خبر ہمارے محلے میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ مجھے اس پر یقین آنے کے بجائے سخت غصہ آیا تھا۔ آخر یہ کیا مذاق ہے؟ محلے کی ایک نہایت سنجیدہ شخصیت کے بارے میں اس طرح کی خبریں اڑانا کہاں کی عقلمندی ہے؟ قاضی صاحب کو میں ہی نہیں سارا محلہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ بہت ہی معقول اور ثقہ قسم کے انسان ہیں۔ شور و غوغا کرنا تو بڑی بات ہے کسی نے انہیں آج تک ذرا بلند آواز سے بولتے نہیں سنا۔ صبح دفتر جانے کے لئے نہایت خاموشی کے ساتھ گھر سے نکلتے ہیں اور سہ پہر کو اسی طرح باوقار طریقے سے واپس گھر آتے ہیں۔ اُن کی نظریں ہمیشہ زمین پر ہوتی ہیں اور وہ محض کسی کی آہٹ سن کر ہی آنے والے کو سلام کہہ دیتے ہیں۔ ان کی صحت اور جسم کی بناوٹ قابلِ رشک ہے۔ لمبا قد، چوڑا چکلا سینہ، بڑی آنکھیں، گورا رنگ اور اس پر گھنی سیاہ داڑھی، اچکن اور شلوار ان کا عام لباس ہے۔ سر پر پٹھانوں کی طرح کلاہ کے ساتھ ریشمی لنگی باندھتے ہیں۔ ان کی چال میں بڑا دبدبہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قاضی صاحب الگ تھلگ رہنے والے انسان ہیں۔ اس تمام سنجیدگی اور متانت کے باوجود وہ محلے کے ایک ایک فرد کے ذاتی حالات سے بخوبی واقف ہیں۔ انہیں اچھی طرح علم ہوتا ہے، محلے میں کون بیمار ہے، کس کے گھر میں کوئی خوشی کی تقریب منعقد ہونے والی ہے، کس کے بچے نیک ہیں، کس کے شرارتی اور دنگا فساد کرنے والے۔ کون میاں بیوی آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور کن میں محبت اور پیار ہے۔ کس کے ذمے کس کا قرض ہے اور کون آسودہ حالی سے زندگی گزار رہا ہے۔

غرض قاضی صاحب کو محلے کی معمولی سے معمولی بات کا بھی علم ہوتا ہے۔ ان کے کردار کی متانت نے انہیں گوشہ نشین نہیں بنایا بلکہ اُن کے تعلقات کو اور مستحکم کیا ہے۔

لیکن آج جب میں شام کو دفتر سے واپس آیا، تو سارے محلے میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کوئی کہتا قاضی صاحب پاگل ہو گئے ہیں، کوئی کہتا کسی نے ان کو پلا دی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا قاضی صاحب نہ پاگل ہوئے ہیں اور نہ ہی کسی نے انہیں کچھ پلایا ہے، بلکہ اُن پر کوئی جن سوار ہو گیا ہے۔ محلے کی عورتیں تو صاف صاف کہہ رہی تھیں کہ آسیب کے سوا اور کوئی دوسری وجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ قاضی صاحب پر جن سوار نہ ہوتا تو وہ اس طرح اُچھل اُچھل کر ناچ ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ناچتے ہوئے اُن کا چہرہ جس شدت سے تمتما اٹھتا ہے یہ آسیب زدہ ہونے کی واضح علامت ہے۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر وہ جس انداز میں اپنے ہاتھ فضا میں لہراتے ہیں اور پھر آنکھیں نکال کر زبان سے کچھ کلمات ادا کرتے ہیں۔ اس سے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اُن کی ذات میں کوئی دوسری مخلوق بول رہی ہے۔ مائی حاجن نے جیسے ہی قاضی صاحب کے بارے میں سُنا کہ وہ ناچ رہے ہیں، فوراً اعلان کر دیا کہ انہیں اور کچھ نہیں ہوا ان پر ماموں اللہ بخش آ گئے ہیں!"

لوگوں نے پوچھا: "یہ ماموں اللہ بخش کون ہیں؟"

مائی حاجن بولیں: "گنگوہ ضلع سہارنپور میں اُن کا مزار ہے۔ جو کوئی شخص پیر فقیر کو نہیں مانتا ماموں اللہ بخش اس کے سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ چونکہ قاضی صاحب پیروں فقیروں کے قائل نہ تھے اس لئے انہیں سبق پڑھانے کے لئے ماموں اللہ بخش نے ان کا یہ حال بنا لیا ہے!"

غلام رسول پان فروش کہہ رہا تھا: "قاضی صاحب پر کوئی جن بھوت کیا آ سکتا ہے؟ وہ اللہ والے اور نیک آدمی ہیں۔ ہر وقت باوضو رہتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے اُن کی زبان پر کلام الٰہی ہوتا ہے! البتہ انہیں فتو حرامی نے کسی نہ کسی طرح پلا دی ہوگی۔ قاضی صاحب اُسے کئی بار کہہ چکے تھے کہ وہ شراب پی کر اس طرح محلے میں اُدل فول بکتا نہ پھرا کرے۔ ابھی پچھلے ہفتے کی بات ہے۔ فتو نے قاضی صاحب کو جل کر طنزیہ انداز میں کہا تھا: "قاضی صاحب میں تو جب جانوں کہ کوئی دارو پی لے اور پھر نہ بہکے" ——— اور جب

قاضی صاحب نے اسے سمجھایا "آخر پینے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟" تو اس نے جواب دیا تھا "قاضی جی پینی بھی پڑ جاتی ہے۔ مجبوری بہت بری بلا ہے"۔ غلام رسول نے فکر و تشویش سے بھرا ہؤا ایک لمبا سانس لیا اور کہا:

"فتو نے اب اس طرح کی بھی غنڈہ گردی شروع کر دی ہے اس کا کوئی علاج ہونا چاہیئے"۔

پروفیسر قدوس نے ایک دم احکام صادر کئے "کس میں ہمت ہے جو قاضی صاحب کو شراب یا کوئی اور نشہ آور چیز دے سکے۔ وہ ایک مضبوط کردار کے انسان ہیں ــــ اور یہ جن بھوت والی بات تو بالکل بکواس اور نان سنس ہے۔ حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ اس ایٹمی دور میں بھی ہمارے لوگ جن بھوت کی باتیں کر رہے ہیں۔ قاضی صاحب کو اس کے سوا اور کچھ نہیں ہؤا کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ ہمارے اس گندے اور ظالم معاشرے میں آدمی کا پاگل ہو جانا کون سی بڑی بات ہے۔ قاضی صاحب ایک حساس اور سمجھدار آدمی ہیں انہوں نے ضرور کسی ظلم کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے اور اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں"۔

میں نے سوچا اِن باتوں پر یقین کرنے کے بجائے کیوں نہ قاضی صاحب کے گھر جا کر اُن کو دیکھا جائے۔ حقیقتِ حال خود بخود واضح ہو جائے گی؛ چنانچہ اس خیال کے آتے ہی میں فوراً قاضی صاحب کے گھر پہنچا۔ گھر بہت ہی مختصر تھا۔ چھوٹے سے غسل خانے، باورچی خانے اور برآمدے کے علاوہ ایک کمرہ اور ایک بیٹھک۔ یہ تھی اس گھر کی ساری مکانیت۔ مگر قاضی صاحب کا کہنا تھا کہ یہ مکان اُن کے لئے کافی ہے۔ گھر کے افراد ہی کتنے ہیں، وہ خود، ایک بچہ اور ایک بیوی۔ قاضی صاحب نے تو خیر اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا، لیکن محلے کی عورتوں نے اُن کی بیوی کو کہتے سُنا کہ قاضی صاحب مشرقی پنجاب میں خاص کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا اپنا گھر بھی تھا اور زمین جائداد بھی، لیکن ۱۹۴۷ء میں جب وہ ہجرت کر کے پاکستان آ رہے تھے تو راستے میں اُن کے قافلے پر حملہ ہؤا جس میں ان کا ایک دس سال کا لڑکا شہید ہو گیا۔ دوسرا بچہ پاکستان آتے ہی کیمپ میں بیمار ہو کر مر گیا۔ قاضی صاحب نے ان دونوں بچوں کی موت کو تو بڑے حوصلے کے ساتھ برداشت کر لیا، لیکن زندگی کے بارے میں ان کا نظریہ بہت کچھ بدل گیا۔

انہیں کئی بار ایسے مواقع میسر آئے کہ مکان اور زمین الاٹ ہو سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ دفتر میں سو روپے ماہوار کی ملازمت کو وہ اپنے اور اپنی بیوی کے لئے بہت کافی سمجھتے ہیں۔ پانچ چھ سال کے بعد ایک بچہ خدا نے دیا، تو انہیں پھر بھی کوئی تشویش نہ ہوئی۔ اب اُن کی تنخواہ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ قاضی صاحب کی زندگی میں خاصا سکون اور اطمینان تھا؛ البتہ وہ ایک شکایت کیا کرتے تھے کہ ہمارے لوگ وقت کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ جہاں کہیں وقت کی بات چلتی قاضی صاحب کا موڈ ایک دم کچھ خراب سا ہو جاتا۔ اس ایک بات کے علاوہ قاضی صاحب کے ماتھے پر کبھی بل نہیں دیکھے گئے۔ بڑی سے بڑی بات کو وہ خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے تھے؛ چنانچہ میں انہی حالات میں کھویا ہوا قاضی صاحب کے گھر پہنچا وہ گھر میں "تنہا تھے۔ بیوی اور بچہ کسی رشتہ دار کے ہاں گاؤں گئے ہوئے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا، لیکن بیٹھک کی کھڑکی آدھی کھلی ہوئی تھی جس میں سے قاضی صاحب صاف نظر آرہے تھے۔ میں نے دیکھا وہ باقاعدہ ناچ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں:

"دمادم مست قلندر"

"دمادم مست قلندر"

"ہو"

"دمام دم"

"ہو"

"دمادم"

"مست قلندر"

میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ انہوں نے اسی طرح ناچتے ہوئے پوچھا "کون ہے"؛ اور پھر دمادم مست قلندر کا ورد شروع کر دیا۔ میں نے اپنا نام بتایا، تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ ناچتے ہوئے دروازے کے قریب آئے اور کنڈی کھول کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھک میں آگیا۔ انہوں نے پھر کنڈی لگا دی۔ وہ اسی طرح ناچ رہے تھے "دمادم مست قلندر"

"دمادم مست قلندر" میں کرسی پر بیٹھنے لگا تو مجھے اشارے ہی سے اپنے ساتھ ناچ میں شرکت کی دعوت دی۔ اس اثنا میں مجھے قاضی صاحب کے چہرے پر اچھی طرح نگاہ ڈالنے کا موقعہ مل گیا۔ میں نے دیکھا کہ اُن کے چہرے سے کسی قسم کی دہشت کے آثار نمایاں نہ تھے، بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں واقعی کوئی خوشی ملی ہے۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ آخر میں نے اُن سے پوچھ ہی لیا:

"قبلہ یہ تو فرمایئے کس تقریب میں یہ رقص کی محفل منعقد ہو رہی ہے؟"

"یہ تو مانتے ہو کوئی خوشی کی بات ہو گی۔"

"جی ہاں یہ تو مانتا ہوں۔"

"پھر پوچھنے والی بات کیا رہ گئی؟"

"پھر بھی۔"

"بھلے آدمی خوشی کی تقریب میں یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ کوئی خوش کیوں ہے؟ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ میں تمہیں خوش نظر آرہا ہوں۔"

"آپ درست فرماتے ہیں لیکن....."

"پھر وہی لیکن....." قاضی صاحب ناراض ہونے لگے تھے، مگر ضبط کر گئے۔ انہوں نے اپنے رقص کا انداز بدلتے ہوئے گانا شروع کیا:

"ہے جمالو! مجھے دل میں بٹھالو۔ ہے جمالو!
مجھے اپنا بنالو۔ ہے جمالو۔"

وہ اس گانے کے ساتھ رقص کرتے جاتے تھے اور میری طرف نہایت ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھتے جاتے تھے۔ ایک بار تو میرا دل بھی چاہا کہ قاضی صاحب کے ساتھ رقص میں شریک ہو جاؤں، لیکن بُرا ہو اس جذبۂ جستجو کا کہ اُن سے پھر پوچھ بیٹھا:

"اجی حضرت! کچھ بتلایئے تو سہی کیا ماجرا ہے؟"

میرا یہ سوال کرنا تھا کہ قاضی صاحب ایکدم ناراض ہو کر بولے: "میں تمہیں سارے محلے میں سب سے

زیادہ عقل مند آدمی سمجھتا تھا' اسی لئے میں نے تمہیں یہاں اندر بلالیا تھا، مگر....." میں نے قاضی صاحب کا فقرہ پورا نہ ہونے دیا اور انہیں خوش کرنے کے لئے کہا: "آپ کی مہربانی ہے۔"

"اب تو میں سمجھتا ہوں میری مہربانی نہیں نادانی تھی۔"

"مجھے معاف کر دیجئے۔" میں نے یہ الفاظ کچھ اس طرح لجاجت سے اور گڑگڑا کر ادا کئے کہ قاضی صاحب کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ کہنے لگے:

"جاؤ میاں تم بھی کیا یاد کرو گے۔ آج خوشی کا دن ہے ہم تمہیں معاف کرتے ہیں۔"

"خوشی کا دن؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس میں حیرانی کی کونسی بات ہے۔ آج کا دن میرے لئے بڑی خوشی کا دن ہے۔ چلو تمہیں بتا ہی دیتا ہوں۔"

"ضرور بتائیے۔"

"پہلے میرے ساتھ مل کر کہو: "دمادم مست قلندر۔" میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی تو انہوں نے فرمایا:"

"تم جانتے ہو جب بلاوجہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ میرے دل پر کیسی قیامت گزرتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"اور تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ جب سے وطنِ عزیز معرضِ وجود میں آیا ہے ایک عام آدمی کا بہت سا وقت ہر روز بلاوجہ ضائع ہوتا ہے۔"

"آپ درست فرما رہے ہیں۔"

"لیکن آج میرا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں گیا......" قاضی صاحب یہ کہتے ہی پھر رقص کرنے لگے۔

دمادم مست قلندر..... دمادم مست قلندر۔ اور پھر دم لے کر بولے: "ہوا یوں کہ میں جیسے ہی صبح گھر سے نکل کر بس سٹینڈ پر آیا، تو مجھے فوراً بس مل گئی اور پھر حیرت کی بات یہ ہوئی کہ اس میں بیٹھنے کے لئے جگہ بھی تھی۔ بس سے اتر کر جس دفتر میں مجھے کام تھا وہاں گیا، تو متعلقہ کلرک بھی میرے ساتھ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آیا اور فوراً میرا چھٹکارا ہو گیا۔"

میں نے کہا: قاضی صاحب! معاف کیجئے یہ دونوں باتیں تو ایسی نہیں ہیں کہ جن کی وجہ سے انسان خوشی کے مارے ناچنا شروع کر دے۔"

"کمال ہے صاحب! بس کا فوراً مل جانا کوئی معمولی واقعہ ہے۔ میرے تو ہر روز محض بس کے انتظار میں دو اڑھائی گھنٹے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آج میں دفتر میں جس کام سے گیا تھا اس میں مجھے خراب ہوتے تین سال گزر گئے۔ ایک خواہ مخواہ کے دشمن نے میرے خلاف ایک جھوٹی عرضی پانچ پیسے کے کاغذ پر لکھ کر دے دی تھی۔ کوئی اس کی تحقیق نہیں کرتا۔ مجھے دفتر میں بلاوجہ بُلا لیا جاتا ہے اور وہاں میرے کئی کئی گھنٹے بلاوجہ صرف ہو جاتے ہیں۔ آج پہلی مرتبہ کلرک نے اپنے پاس بلا کر تین منٹ میں مجھے یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ صاحب چھٹی پر ہیں۔ ورنہ اتنی سی بات کے لئے بھی گھنٹوں بیٹھنا پڑتا تھا۔"

"لیکن قاضی صاحب میں اب بھی یہی کہوں گا کہ یہ باتیں بہت ہی معمولی ہیں۔"

"معلوم ہونا چاہیئے کہ کسی معاشرے کی تباہی کے دن اسی وقت قریب آتے ہیں جب اُس کے افراد کے لئے معمولی سے معمولی باتیں غیر معمولی بن جاتی ہیں۔"

"باتوں کو غیر معمولی کون بناتا ہے؟ میں یا آپ؟"

"نہ میں اور نہ تم بلکہ ہم سب۔"

"گویا کوئی بھی نہیں۔"

"میں نے یہ کب کہا ہے۔"

"سب کو ذمہ دار ٹھہرانے کا مطلب تو یہی نکلتا ہے۔"

"ہرگز نہیں۔"

"پھر ہم کس طرح ذمہ دار ٹھہرتے ہیں؟"

"اس طرح کہ جب معمولی باتیں غیر معمولی بنتی ہیں تو ہم خاموشی سے انہیں برداشت کرتے رہتے ہیں اور یوں مستقل بے حسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔"

"پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"بھئی تم میری خوشی کو کیوں برباد کر رہے ہو۔ ہر سوال کا جواب مجھ سے مانگتے ہو۔ کبھی خود بھی سوچنے کی تکلیف گوارا کر لیا کرو۔" یہ کہہ کر قاضی صاحب نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنی بیٹھک سے باہر نکالتے ہوئے بولے۔ "جاؤ میاں اپنے گھر آرام سے بیٹھو۔" انہوں نے اندر سے کنڈی لگائی اور دوبارہ بڑے جوش و خروش سے ناچنا شروع کر دیا۔

"دمادم مست قلندر"

"دمادم مست قلندر"

"ہو"

"دمادم"

"ہو"

"دمادم"

میں واپس گھر کی طرف چل پڑا۔ قاضی صاحب کے رقص اور اُن کی آواز نے خاصی دُور تک میرا تعاقب کیا۔

مجھے گالی دیجئے

دل کی اُلٹی سیدھی خواہشات سے بھی خدا بچائے۔ آجکل میری طبیعت بہت مچل رہی ہے کہ کوئی مجھے جی بھر کر گالیاں دے۔ میں اکثر اِس تمنا میں لوگوں کا منہ تکتا رہتا ہوں، لیکن سخت مایوسی ہوتی ہے۔ گالیاں دینے کے بجائے لوگ محبت کا اظہار فرمانے لگتے ہیں۔ مجھے لوگوں کے اس حُسنِ سلوک پر خوش ہونا چاہئے، لیکن میں جل کر کباب ہو جاتا ہوں۔ بس رہ رہ کر یہی خیال آتا ہے کہ آخر لوگ گالیاں کیوں نہیں دیتے؟ ان کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ بالکل مٹی کے مادھو کیوں بن کر رہ گئے ہیں؟ ان میں سے زندگی کہاں چلی گئی ہے؟ انہیں کیا ہو گیا ہے؟

ایک دفعہ ایک دوست میرے پاس آیا، کہنے لگا:

"مشکور! میرا ایک کام تو کرو۔"

میں نے کہا: "فرمائیے! میں جس قابل ہوں، حاضر ہوں۔"

اُس نے کام بتایا، تو میرے غصے اور حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ مجھ سے انتہائی غلط سفارش کرانے کے لئے آیا تھا۔ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"لیکن میرے دوست! تمہیں مجھ سے یہ بات کرتے ہوئے شرم نہیں آئی؟"

اُس نے فوراً جواب دیا: "اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ آج کل سب اسی طرح کر رہے ہیں؟"

میں نے بزعمِ خود اُسے دوبارہ اُس کی غلطی کا احساس دلانے کے لئے کہا:

"چلو تمہیں میرا خیال نہیں آیا تھا، تو اس شریف آدمی کا خیال ہی کر لیتے جس کے پاس تم مجھے یہ غلط سفارش

کرانے کے لیئے جانا چاہتے ہو؟"

وہ میرے اس جملے پر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا:

"تم کون سی دنیا کی باتیں کر رہے ہو دوست، خیالوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آؤ۔ اوّل تو جائز کام کے لیے سفارش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دوسرے یاد رکھو، سفارش ہمیشہ ناجائز کام کی ہوا کرتی ہے اور اپنے فائدے کے لیئے ایسا کرنا کوئی جرم نہیں۔"

اس کے مسلسل اصرار کے باوجود میں نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں اس غلط کام کے لیئے اس کے ساتھ جانے کو ہرگز تیار نہیں ہوں۔ اس نے جب دیکھا کہ میں اپنی ضد سے کسی طرح باز نہیں آ رہا ہوں فوراً لہجے میں تبدیلی پیدا کرتے ہوئے بولا:

"تم میرے دوست ہو۔ اگر تم ہی اس وقت کام نہ آئے تو کون آئے گا۔ آخر میرا بھی تو کوئی حق ہے تمہیں ساتھ چلنا ہوگا۔"

میرے کردار کی ایک بڑی کمزوری یہ بھی ہے کہ اس قسم کے مواقع پر میں دیر تک مستقل مزاج نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی مجھے زیادہ مجبور کرے، تو طوعاً و کرہاً اس کے ساتھ چل پڑتا ہوں، چنانچہ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ جب دوست کا اصرار بہت بڑھا، تو میں اس کے ساتھ چلنے کے لیئے رضامند ہوگیا، البتہ جانے سے قبل میں نے یہ شرط ضرور عائد کی کہ میں یہ سفارش بہت صاف اور واضح الفاظ میں کروں گا اور جن صاحب کے پاس سفارش کرنی ہے میں ان سے کہوں گا کہ "محترم، اگر آپ نے پہلے بھی کسی کا کوئی ناجائز کام سرانجام دیا ہے، تو میرے اس دوست کا کام بھی کر دیجئے۔ میں نے سوچا جب اس انداز سے سفارش کروں گا، تو وہ صاحب جن کے پاس سفارش لے کر جانا ہے، یکایک مجھ سے ناراض ہو جائیں گے اور کہیں گے: "مشکور، تم بڑے ذلیل آدمی ہو، میرے پاس ایسی واہیات قسم کی سفارش لاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی؟" ان صاحب کے یہ الفاظ سن کر مجھے غصہ آئے گا اور میں یہ غصہ اس دوست پر ہی بھر کر اتار سکوں گا، چنانچہ میں اس دوست کو لے کر ان صاحب کی قیام گاہ پر پہنچا۔ جاتے ہی میں نے اپنے آنے کا مقصد واضح الفاظ میں بیان کر ڈالا۔ میں ڈر رہا تھا کہ بس ابھی یہ صاحب مجھ پر برس پڑیں گے، لیکن میری توقع کے برعکس انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا: "مشکور صاحب آپ نے نہایت صاف گوئی

سے بات کی ہے۔ میں آپ کے خلوص کی قدر کرتا ہوں' اپنے دوست سے کہہ دیجئے' اُن کا کام ہو جائے گا۔"
میرا دوست آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرایا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس "عزت افزائی" سے میری آبرو خاک میں مل گئی ہے۔ میں سوچتا رہ گیا اگر یہ صاحب میری پذیرائی کے بجائے مجھے گالیاں دے ڈالتے' تو غالباً اس طرح میری بے حرمتی نہ ہوتی۔ گالیاں بھی انسان کی عزت بڑھاتی ہیں' مجھے زندگی میں پہلی بار اس حقیقت کا احساس ہوا۔

اسی طرح ایک روز ایک دوسرا دوست آیا۔ وہ بھی مجھ سے کوئی ناجائز سفارش کرانا چاہتا تھا جن صاحب کے پاس سفارش کرنا تھی' وہ نہایت ثقہ آدمی تھے۔ میں نے فوراً کہا:

"نا بھائی' میں اُس شخص کے پاس ہرگز ہرگز جانے کے لئے تیار نہیں۔ وہ بہت کٹر آدمی ہے۔"
دوست نے جواب دیا؟ "یار تم اسے کہہ کر تو دیکھو' زیادہ سے زیادہ یہی ہے نا کہ وہ انکار کر دے گا۔ میرے دل میں حسرت تو باقی نہ رہے گی۔"
"ممکن ہے اُس کے انکار سے آپ کو کچھ محسوس نہ ہو' لیکن میرے لئے تو ڈوب مرنے کا مقام ہو جائے گا۔"

دوست اس جواب پر مجھ سے بُری طرح ناراض ہو کر چلا گیا۔ میرے کردار کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ میں کسی کی ناراضی برداشت نہیں کر سکتا' خواہ کوئی مجھ سے بلاوجہ ہی ناراض کیوں نہ ہو گیا ہو۔ میں دوست کے چلے جانے کے بعد بہت دیر تک افسردہ خاطر رہا۔ اتفاق دیکھئے اگلے روز ہی میری ملاقات اُن صاحب سے ہو گئی جن کے پاس مجھے وہ دوست سفارش کے لئے لے جانا چاہتا تھا۔ اُن صاحب کے پاس پہلے سے ایک بزرگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں آیا' تو وہ خاموش ہو گئے۔ علیک سلیک کے بعد اُن صاحب نے اِن بزرگ سے کہا:

"ہاں صاحب' آپ اپنی گفتگو جاری رکھیے' منشکور صاحب اپنے آدمی ہیں' ان سے کوئی پردہ نہیں' آپ بے فکر ہو کر بات کریں۔"
میں نے اُن بزرگ کی گفتگو سنی' تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ناجائز سفارش لے کر آئے ہیں اور صاحب اُن بزرگ کی سفارش ماننے کے لئے سو فی صدی آمادہ ہیں۔ اس وقت مجھے اپنا ناراض دوست بُری طرح یاد آیا' لیکن

میرے دل کا حال کچھ عجیب تھا۔ میں شدت سے محسوس کر رہا تھا کاش! کوئی مجھے اس وقت موٹی موٹی چار پانچ گالیاں دے سکتا۔

یوں تو ہم گالیوں کو بہت برا خیال کرتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں ایسی صورتِ حال میں گالیاں انسانی کردار کی حرمت و آبرو کی علمبردار بن جاتی ہیں۔ گالی کے بغیر زندگی بے نور نظر آتی ہے۔ اس طرح معلوم ہونے لگتا ہے جیسے گالی کیا غائب ہوگئی غیرت و حمیت کا خاتمہ ہوگیا۔ گالی انسانیت کا وقار ہے، گالی شعور کو بیدار کرتی ہے۔ ہمیں جینا سکھاتی ہے، گالی ہماری راہنما ہے، ہمیں صحیح راستہ دکھاتی ہے۔ گالی کیا مر گئی، ہم مر گئے ہیں۔ گالی طاقت ہے، جوانمردی ہے، شجاعت ہے، حوصلہ ہے، ہمت ہے۔ اگر ہم گالی نہیں دے سکتے، تو سمجھ لیجئے ہم کمزور ہو گئے ہیں، ہم میں حوصلہ باقی نہیں رہا۔

ابھی چند دنوں کا ذکر ہے میں اسی طرح گالیاں کھانے کی آرزو دل میں لئے بیٹھا تھا کہ میرے ایک پروفیسر دوست آگئے، پوچھنے لگے:

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہ سوچ رہا ہوں کہ لوگ اتنے مہذب کیوں ہو گئے ہیں کہ مجھے ایک گالی تک نہیں دے سکتے۔"

"معلوم ہوتا ہے تمہارے سر پر پھر کسی سیدھی سادھی بات کو گھما پھرا کر کہنے کا جنون سوار ہوا ہے۔ میشگو، خدا کے لئے صاف صاف بات کیا کرو، ٹھیک ٹھیک بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں بالکل صاف لفظوں میں کہہ رہا تھا کہ میں گالیاں کھانا چاہتا ہوں اور لوگ مجھے گالیاں نہیں دیتے۔"

پروفیسر صاحب نے ہنس کر فرمایا: "ارے بھائی، ہمارے ہاں گالیوں کی کیا کمی ہے۔ جدھر دیکھو گالیوں کے انبار لگے ہیں۔ بچوں کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ کیا جوان کیا بوڑھے، سب کے منہ گالیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ ہر موقع و محل پر جب چاہو ماں بہن کی گالیاں بصد شوق سن سکتے ہو۔"

میں نے جواب دیا: "ماں بہن کی گالی بھی کوئی گالی ہوتی ہے۔" پروفیسر صاحب ذرا چونکے، تو میں نے کہا "جنابِ والا، ماں بہن کی گالی کبھی کسی کو نہیں دی جاتی۔ یہ گالی تو خود دینے والے کے منہ پر تڑاخ سے جا کر لگتی ہے۔"

پروفیسر صاحب جھنجلا کر بولے: "تو پھر یار تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کوئی مجھے ایسی تیز طرار گالی دے جو براہ راست میرے دل پر جا کر لگے۔ جو میرے جذبۂ غیرت کو جھنجھوڑ ڈالے، جس سے میری بے حسی کا جمود ٹوٹے، جو میری کم ہمتی کا مداوا بن سکے۔"

پروفیسر صاحب لمبی سانس لے کر بولے: "میرے دوست، تمہیں اس طرح کی گالی کوئی نہیں دے سکے گا۔ ظالم، ڈرپوک اور بد دیانت معاشرے کے افراد زیادہ سے زیادہ ماں بہن کی گالی ہی دے سکتے ہیں اور بڑی ہمت ہوئی، تو تمہارے باپ دادا کو تُوم کر رکھ دیں گے۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ کوئی براہِ راست تمہیں گالی دے، تو فی الحال تمہاری یہ آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔"

"پروفیسر! ایسا نہ کہو۔ مجھے گالی کی سخت ضرورت ہے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ گالی نہ دی گئی، تو دونوں صورتوں میں سے ایک یقینی ہے۔ یا تو میں پاگل ہو جاؤں گا یا میری موت واقع ہو جائے گی۔"

"مطمئن رہو میری جان، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم بڑے سخت جان واقع ہوئے ہو۔" پروفیسر نے بیدردانہ وثوق سے کہا۔

"پروفیسر، تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔"

"کوئی کسی کا مذاق نہیں اڑا سکتا۔"

"اگر تم سنجیدہ ہو، تو میری بات دھیان دے کر سنو۔"

"ایک پروفیسر اور سب کچھ ہو سکتا ہے، لیکن غیر سنجیدہ کبھی نہیں ہوتا۔ تم کو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"بس اس وقت تو میری ایک ہی آرزو ہے، وہ تم ہی پوری کر دو۔"

"ہاں ..... ہاں ..... کہو، وہ آرزو کیا ہے؟"

"مجھے ایک بھرپور سی گالی دے ڈالو۔"

پروفیسر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا:

"واہ بھئی واہ، میں اور گالی، تم بھی خوب سمجھدار آدمی نکلے ــــ ارے بھائی، اگر پروفیسر گالی دے سکتا، تو پھر رونا کس بات کا تھا۔ یقین کرو مجھ میں گالی دینے کی ذرا بھی ہمت نہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہاں کسی میں

کسی کو براہِ راست گالی دینے کا حوصلہ نہیں ۔اب چونکہ گالی دینا انسان کی فطرت میں داخل ہے اس لئے اس فطری خواہش کو پورا کرنے کے لئے ہم لوگوں نے یہ راہ نکالی ہے کہ جب کوئی مرجاتا ہے یعنی کمزور ہوجاتا ہے اور اپنا اقتدار کھو بیٹھتا ہے تو ہم اُسے گالی دینا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ اصل گالی تو اقتدار کو دی جاتی ہے ۔" پروفیسر صاحب نے ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پھر بولے "مشکور سچ پوچھتے ہو تو اقتدار ہی گالی کھاتا ہے اور اقتدار ہی گالی دیتا ہے ۔۔۔ چونکہ نہ تم میں کوئی قدرت ہے اور نہ مجھے اپنے میں کچھ نظر آتا ہے اسی لئے نہ میں تمہیں گالی دے سکتا ہوں اور نہ تم مجھے ۔گالی تو تنقید ہوتی ہے بے لاگ تنقید اسی لئے ماضی سے زیادہ حال کو اس کا آرزو مند ہونا چاہیئے ۔ اِدھر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنی گالیوں کی تمام قوت و جبروت ماضی کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حال تک آتے آتے ہماری گالیوں کے تمتماتے ہوئے چہرے زرد پڑ جاتے ہیں ۔تمہیں معلوم ہے گالی کا چہرہ زرد پڑ جائے، تو پھر وہ گالی نہیں رہتی خوشامد بن جاتی ہے ۔"

مَیں نے تنگ آکر کہا :

" پروفیسر صاحب اگر آپ اس لمبی چوڑی تقریر کے بجائے مجھے ایک عدد گالی عنایت فرما دیتے ،تو شاید میری سمجھ میں یہ تمام باتیں آسانی سے آجاتیں جنہیں آپ سمجھانے کی اس قدر کوشش کر رہے ہیں ۔"

پروفیسر غصے میں آکر بولا :

" مشکور کیا تم واقعی گالی کھانا چاہتے ہو ۔اگر یہ بات ہے تو تم حق کی طرف داری کرو، محنت سے کام کرو، دیانتداری سے اپنے فرائض کو سرانجام دو پھر دیکھنا میں کیا پوری قوم تمہیں گالیاں دے گی تم لوگوں سے محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آؤ تو تم پر گالیاں ہی نہیں بے شمار لعنتیں بھی پڑیں گی ۔۔۔ مگر تمہارے ساتھ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ بیٹھے بٹھائے گالیاں کھانا چاہتے ہو، بالکل اسی طرح جس طرح ہم سب بیٹھے بٹھائے سب کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔مشکور حقائق سے گریز تمہارا ہی مسئلہ نہیں ، ہم سب کا مسئلہ ہے ۔"

پروفیسر صاحب اپنی دانست میں مجھے بہت سی گالیاں دے گئے لیکن میں اپنی طبیعت کو دیکھتا ہوں تو وہ اسی طرح گالیوں کا تقاضا کر رہی ہے معلوم نہیں یہ میری بے حسی کی دلیل ہے یا دوستوں کی آواز بے جان ہو کر رہ گئی ہے ۔

صبح ہوتے ہوتے

"تمہیں اپنے گدھے ہونے میں تو کوئی شک نہیں ؟"

"کوئی شک نہیں۔"

"شاباش۔"

"تم اپنے گدھے ہونے پر فخر بھی کرتے ہو؟"

"جی ہاں ہمیں فخر ہے۔"

"لیکن تم کل کے دن گدھے نہیں رہو گے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے ؟"

"میں جو کہہ رہا ہوں۔"

"بہتر ہے جناب۔"

"تم نے میری ہاں میں ہاں ملا دی، لیکن یہ نہیں سوچا کہ اگر تم گدھے نہیں رہو گے، تو پھر کیا بنو گے ؟"

"واقعی یہ تو بڑا اہم سوال ہے۔"

"اہم ضرور ہے، لیکن مشکل نہیں۔"

"تو پھر ہمیں بتا دیجیے کیا بننا ہے؟"

"تم کل سب کے سب گھوڑا بن کر دکھاؤ گے۔"

"گدھے کس طرح گھوڑا بن سکتے ہیں؟"

"کام اور محنت کے ذریعے۔"

"کام اور محنت تو گدھے بھی کرتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"پھر غلط کیا ہے؟"

"سنو! گدھے کام کرتے ہیں لیکن اپنی مرضی سے نہیں بلکہ ڈنڈے کھا کر۔ اس کے برعکس گھوڑے اپنی مرضی سے کام کرتے ہیں۔"

"مطلب یہ ہوا کہ اگر گدھے اپنی مرضی اور شوق سے کام کرنے لگیں، تو گھوڑے بن جائیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔"

"ہم یقین دلاتے ہیں کہ کل آپ ہمیں گھوڑا بنا دیکھیں گے۔"

"شاباش۔"

اس کے بعد تمام گدھوں نے ہنہنانا شروع کر دیا، لیکن ان کے منہ سے ڈھی چوں ڈھی چوں کی آوازیں ہی نکل رہی تھیں۔ وہ خاصے پریشان تھے۔ انھوں نے اپنے مالک سے گھوڑا بن جانے کا وعدہ کر لیا تھا لیکن بات نہیں بن رہی تھی۔ جب انھوں نے مسلسل کوشش کے باوجود دیکھا کہ ان کی آوازیں خاطر خواہ تبدیلی واقع نہیں ہوئی، تو انھوں نے گھوڑے کی طرح دو ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی مشق شروع کر دی۔ ہر گدھا دو ٹانگوں پر کھڑا ہونے کے لیے سخت بے چین تھا۔ اس جدوجہد میں کامیابی کے بجائے انھیں بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ کھڑے ہوتے، لیکن فوراً ہی دھڑام سے زمین پر گر جاتے تھے۔ سب نے فیصلہ کیا کہ ایک دوسرے پر دولتیاں چلائی جائیں۔ اس طرح ایک تو ذرا طبیعت بحال ہو جائے گی، دوسرے سب کے سب لہولہان ہو کر خواہ بظاہر ہی سہی، گھوڑے نظر آنے لگیں گے۔ کہتے ہیں لہو میں بڑی طاقت ہے، لہو کایا پلٹ دیتا ہے۔ یہ فیصلہ ہوتے ہی سب نے ایک دوسرے پر دولتیاں چلانی شروع کر دیں۔ دولتیاں مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "ہم اب تک سست کیوں رہے؟"۔۔۔۔ تڑاخ۔۔۔۔ "ہم نے کام کیوں نہ کیا؟"۔۔۔ تڑاخ۔۔۔ "ہم اتنے بے غیرت کیوں ہو گئے؟"۔۔۔ تڑاخ۔۔۔ "ہم نے غیر ذمہ داری کو اپنا شعار کیوں بنا لیا؟"۔۔۔ تڑاخ۔۔۔

تڑاخ ..... پڑاخ ..... پڑاخ ..... پٹاخ ..... بُری طرح دولتیاں چل رہی تھیں ..... "یار کالو! اتنی زور سے کیوں مارتا ہے؟" ..... "ارے بدھو! تُونے تو مار ہی ڈالا ..... سیدھی دل پر چوٹ لگی ہے" ..... "ابے جھوٹ کیوں بولتا ہے؟ ..... دل پر چوٹ لگتی تو اپنا یہ حال کیوں ہوتا ..... دل تو جیسے سالا اپنے بس رہا ہی نہیں" ..... "او شیرے! تیرا ستیاناس جائے ..... آنکھیں ہی پھوڑ ڈالیں" ..... تڑاخ ..... "ابے گھبراتا کیوں ہے۔ جن آنکھوں سے کچھ دکھائی نہ دے انہیں پھوٹ ہی جانا چاہیئے" ..... "سچ کہتا ہے پیارے"

گویا جب سے حکم ملا تھا گدھوں نے گھوڑا بننے کی تمنا میں ایک دوسرے کے دولتیاں مار مار کر اپنے آپ کو لہولہان کر لیا تھا۔ رات تیزی سے گزر رہی تھی اور پچھلے پہر کا سماں آپہنچا تھا۔ آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ ہوا کی نرم رفتاری بھی بتا رہی تھی کہ صبح ہونے والی ہے زمین کے سینے سے بھی آمدِ سحر کی خوشبو پھوٹنے لگی تھی۔ گدھے آنے والی صبح کا عجب شوق سے انتظار کر رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ گھوڑے بن جائیں گے۔ وہ اپنی زندگی میں شاید پہلی بار یہ محسوس کر رہے تھے کہ مالک کے لفظوں میں کس قدر جادو کا اثر ہے۔ یہ درست ہے کہ اُن کی کایا پلٹ ان کے اپنے ارادے اور عزم کی وجہ سے ظہور میں آئے گی، لیکن اس کے باوجود انہیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں تھا کہ یہ سب مہربانی اُن الفاظ کی ہے جو ان کے مالک کی زبان سے اس لئے ادا ہوئے تھے کہ اُن کے مالک نے ان پر بھروسہ کیا تھا۔ ترقی کا تمام دار و مدار اعتماد اور یقین پر ہے۔ وہ تھکے ہارے اپنے ہی خون میں رنگے ہوئے پڑے سوچ رہے تھے۔ آخر اس سے پہلے اُن پر کیوں نہ اعتماد کیا گیا۔ ایک گدھے نے دھڑ دھڑی لی اور کھڑے ہو کر ہنہنایا۔ اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی آواز میں گھوڑے کی سی آواز کا وقار پیدا ہو گیا ہے۔ اس کو دیکھ کر دوسرے گدھے بھی ہنہنائے۔ ان کے ہنہنانے میں بھی وہی رُعب اور وقار تھا سب نے سوچا اگرچہ ابھی صبح نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود ہم میں گھوڑے پن کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ صبح ہو گی تو انشاء اللہ ہم سو فی صد گھوڑے بن چکے ہوں گے۔ اس خیال کے آتے ہی سب نے دو ٹانگوں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور وہ آسانی سے کھڑے ہو گئے "مارے کمال ہے۔ ہم تو واقعی گھوڑا بن رہے ہیں۔ توبہ توبہ گدھے بنے رہنا بھی کس قدر مضحکہ خیز صورتِ حال ہے۔ کام بھی کروا ور ڈنڈے بھی کھاؤ۔ نہ کوئی عزت نہ حرمت۔

ادھر عزم اور حوصلے کو دیکھو۔ بلا کی چیزیں ہیں۔ کون سا انقلاب ہے جو اُن کے سہارے برپا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اتنی معمولی سی بات ہماری سمجھ میں پہلے کیوں نہ آئی۔ عزم اور ہمت سے کام لیا ہوتا تو اب سے کہیں پہلے گھوڑا بن گئے ہوتے، بلکہ شاید اس سے بھی آگے کچھ اور۔ کہتے ہیں گھوڑے سے انسان بن جانا ایسی کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ بہرحال ہمیں اس سے پہلے ہوش میں آجانا چاہئے تھا، مگر خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔"

تمام گدھے اسی قسم کے خیالات میں مگن تھے، لیکن اس کے باوجود صبح کی آمد کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا تو صبح کا تارا ابھی انہیں آنکھ مار رہا تھا اور کہہ رہا تھا: "گھبراؤ نہیں ابھی صبح ہونی ہے گھبراؤ نہیں ابھی صبح ہوتی ہے۔"

وہ بھی جواب میں کہہ رہے تھے: "یار ہم گھبرا نہیں رہے ہیں۔ ذرا شوق نے بے چین کر دیا ہے۔" یہ مکالمہ سُن کر نزدیک ہی لیٹے ہوئے چند بوڑھے گدھے بولے: "ارے کم بختو! خود کو کس مصیبت میں گرفتار کر رہے ہو؟ گدھا بنے رہنے میں بڑی عافیت ہے۔ نہ کوئی ذمہ داری اور نہ کسی قسم کی پوچھ گچھ۔ کام ہو گیا تب خیر، نہ ہوا تب کوئی آفت نہیں آجاتی۔ زیادہ سے زیادہ دو ڈنڈے پڑ گئے۔" سب گدھوں نے ایک زبان ہو کر کہا: "خاموش ہو جاؤ جی! کیوں ہمیں ذلت کے گڑھے میں پڑے رہنے کی تلقین کر رہے ہو۔"

گدھے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اُن کے مالک کی طرف سے اعلان ہوا: "گدھوں کو گھوڑا بننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ حسبِ سابق آنے والے دن میں کام کے بجائے عیش کریں اور چھٹی منائیں۔ (یعنی اپنے گدھے پن کا بھی کھول کر مظاہرہ کریں) یہ اعلان سنتے ہی جیسے گدھوں کی امنگوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ بے اختیار ہو کر بولے: مالک یہ تم نے کیا کیا۔ تم ایک اچھا فیصلہ کرتے ہو، پھر اس پر قائم کیوں نہیں رہتے۔ یہ درست ہے کہ تم خلوص کے ساتھ یہ سب کچھ کرتے ہو، لیکن تمہیں ہماری صلاحیتوں پر بھی تو یقین ہونا چاہئے۔ ہم حقیر ہیں لیکن اتنے بھی گئے گزرے نہیں کہ تمہارے حکم کی تعمیل نہ کر سکیں۔" دن نکل رہا تھا اور گدھے ایک دوسرے کو ایسی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ ابھی تک سو رہے ہیں۔

ضمیر کی جلاوطنی

ضمیر میرے بچپن کا دوست ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اسے اپنے ساتھ پایا۔ ہم کبھی پل بھر کو بھی ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوئے۔ قیام پاکستان سے قبل وہ اکثر خوش و خرّم رہا کرتا تھا۔ بشاشت اس کی زندگی میں گویا رچ بس چکی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں خون کا سمندر پار کر کے وہ لاہور پہنچا، تو اس وقت بھی مُسکرا رہا تھا، وہ بُری طرح لہولہان تھا۔ قریب قریب اس کے تمام عزیز و اقارب شہید ہو چکے تھے، لیکن اس کے باوجود اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح شگفتہ تھا۔ میں نے حیرت سے پُوچھا:

"یار تم اس وقت بھی مُسکرا رہے ہو؟"

اس نے فوراً جواب دیا: "جیتی جاگتی قوموں کی زندگی میں ایسے مرحلے آیا ہی کرتے ہیں، اس میں گھبرانے اور پریشان ہونے کی کون سی بات ہے؟"

چند ہی روز بعد اس کی طبیعت میں بلا کا تغیر آ گیا۔ وہ ہشاش بشاش نظر آنے کے بجائے آزردہ رہنے لگا۔ پھر اس کی یہ آزردگی بھی بہت جلد چڑچڑے پن اور جھنجھلاہٹ کی منزلوں سے گزرتی ہوئی افسردگی کی صورت اختیار کر گئی۔ ہمیں جس دن عارضی طور پر زمین الاٹ ہوئی میں نے خوش خوش ضمیر کو خبر سنائی:

"دوست مبارک ہو ہمیں زمین الاٹ ہو گئی ہے۔ اس میں ہری بھری فصلیں کھڑی ہیں آموں کے درخت بھی ہیں۔"

لیکن میں نے دیکھا، اس خبر کو سن کر ضمیر کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نمودار نہ ہوا۔ اس نے صرف اتنا کہا:

"زمین الاٹ ہو گئی تو کیا کرو گے؟"

میں نے جواب دیا: "عیش کریں گے اور کیا؟"

میرے اس جواب پر تو جیسے اس کے چہرے کا رہا سہا خون بھی خشک ہو گیا۔ اس نے اپنی زرد رنگت اور کانپتے ہوئے خشک ہونٹوں سے صرف ایک لفظ ادا کیا: "عیش" اور پھر خاموش ہو گیا مجھے اس کا یہ ردِ عمل ایک آنکھ نہ بھایا۔ یہ خوش ہونے کا موقع تھا، لیکن ہمارے ضمیر صاحب اس وقت عالمِ نزع میں نظر آ رہے تھے۔ یہ کہاں کی عقلمندی اور رفاقت ہے؟ اسی طرح جب ہمیں ایک بہت عمدہ اور کشادہ مکان ملا تو ضمیر خوش ہونے کے بجائے رنجیدہ خاطر تھا۔ وجہ پوچھی، تو ارشاد ہوا:

"تم لوگوں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر مکان حاصل کیا ہے، یہ کوئی اچھی بات نہیں۔"

جب ہم نے جواب دیا کہ ہماری تو پھر بھی کوئی حیثیت تھی، بہت سے لوگوں کے پاس مکان کے نام کا جھونپڑا تک نہ تھا، لیکن وہ کوٹھی والے بن بیٹھے۔ اس پر ضمیر بولا:

"یہ جواب نہیں، محض تمہارا عذرِ لنگ ہے دوسرے خواہ کچھ کریں، تم کیا کرتے ہو، کبھی اس طرح بھی سوچا ہے؟"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ضمیر کا دماغ خراب ہو گیا ہے اور واقعی جب ہم سے یہ عمدہ مکان چھن گیا اور ہم ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہنے لگے، تو میں نے دیکھا، ضمیر اس دن خاصا مطمئن تھا میں نے طنزیہ انداز میں کہا:

"لیجئے جناب ضمیر صاحب، اب تو آپ خوش ہیں؟"

"خوش ہونے والی تو کوئی بات نہیں، البتہ کچھ اطمینان ضرور حاصل ہوا ہے۔"

بعد ازاں خاصی تگ و دو کے بعد مجھے ایک ملازمت مل گئی۔ میں نے اس روز بھی ضمیر کا ردِ عمل دیکھنا چاہا، اس کے رویے سے ایک طرح کی بے تعلقی کا اظہار ہو رہا تھا۔ مجھے ملازم ہوئے ایک دو ماہ

ہی گزرے تھے کہ میرے سامنے تین ہزار روپے کی رشوت پیش ہوئی۔ میں جی ہی جی میں بہت خوش تھا۔ سوچ رہا تھا پاکستان میں آئے دو سال ہو گئے، لیکن ابھی تک گرم کپڑے نہ بنوا سکا۔ گھر کا دوسرا ضروری سامان بھی لانا باقی ہے۔ چلو ان تین ہزار میں سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن جونہی میں نے یہ رقم وصول کرنے کے لئے ہاتھ بڑھائے، ضمیر کے چہرے کی پیلی رنگت سُرخی میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے کمزور ہاتھوں نے میرے مضبوط ہاتھوں کو شکنجے میں جکڑ لیا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا،

"خبردار، جو تم نے ان روپوں کو ہاتھ بھی لگایا۔"

میں نے وہ رقم وصول نہیں کی، لیکن مجھے ضمیر پر بہت غصہ آیا۔ یوں لگا جیسے اُسے میری ترقی اور خوشحالی سے حسد ہے۔ وہ مجھے زندگی میں خوشحال دیکھنا نہیں چاہتا، وہ میرا دوست نہیں دشمن ہے، ظالم اور سفاک کہیں کا ——— خدا اسے غارت کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ ضمیر صرف میرا ہی دوست نہ تھا، قیام پاکستان کے وقت اس کے دوستوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا مگر ضمیر کے چمنِ دوستی پر بہت تھوڑے عرصے کے لئے بہار آئی اور رفتہ رفتہ سب دوستوں نے اس سے اپنا دامن چھڑا لیا۔ اس نے پاکستان آتے ہی سب سے زیادہ ایک افسر سے دوستی بڑھائی۔ میں نے کہا:

"یار ضمیر، تم بڑے اُستاد آدمی ہو، خود تو افسروں سے دوستی کرتے پھرتے ہو اور ہمیں اخلاقیات اور خودداری کے سبق پڑھاتے ہو۔"

ضمیر نے جواب دیا: "تم بھی نرے چغد ہو، ارے بھائی میں افسروں سے دوستی اس لئے بڑھانا چاہتا ہوں کہ آئندہ پاکستان میں بیورو کریسی ہی واحد جماعت نظر آتی ہے جو مُلکی معاملات پر اثر انداز ہو گی۔ اگر میری دوستی ان لوگوں سے قائم رہی تو ان کا راہ راست سے بھٹک جانا آسان نہ رہے گا، یاد رکھو، اگر یہ افسر لوگ راہ راست سے بھٹک گئے تو پھر سمجھ لو ملک میں وہ بے قاعدگی اور افراتفری ہو گی جس کے تصوّر سے بھی میری روح کانپتی ہے۔"

میں نے پوچھا: "ضمیر کیا خیال ہے، تمہاری ان لوگوں سے دوستی برقرار رہ سکے گی؟"

ضمیر نے فوراً جواب دیا: "کیوں نہیں؟ ضمیر سے ہر انسان کی دوستی قائم رہ سکتی ہے۔ بھائی میں تو ہر انسان کے دل میں اُتر جاتا ہوں، ہاں یہ بات الگ ہے کوئی اپنے دل کے دروازے ہی بند کرلے۔"

ہماری اس گفتگو کو کچھ دن ہی گزرے تھے کہ ایک روز کیا دیکھتا ہوں، ضمیر بہت بُرے حال میں چلا آرہا ہے۔ میں نے پوچھا،

"میاں ضمیر کیا بات؟"

"وہ جو میرا افسر دوست ہے نا، جس کی دوستی کے طعنے تم مجھے اکثر دیتے رہتے ہو" ضمیر نے کہنا شروع کیا: "میں اسے کئی دن سے سمجھا رہا تھا، وہ عوام کے ساتھ اُکھڑ اُکھڑ کر بولتا تھا۔"

"آخر بے چارے افسر بھی کیا کریں، عوام اور ان کے مسائل کا کوئی شمار نہیں، وہ بھی تنگ آجاتے ہیں۔" میں نے ضمیر کی بات کاٹی، مگر اس نے مجھے خاموش کرتے ہوئے جواب دیا:

"میری بات تو پوری طرح سنو، اول تو ایسے موقع پر افسروں کو برداشت سے کام لینا چاہیئے۔ تنگ آکر بات کرنا اور معنی رکھتا ہے اور کسی بات کو سرے سے اہم ہی نہ سمجھنے کا مطلب کچھ اور ہے میں نے محسوس کیا، میرا یہ افسر دوست عوام کے مسائل کی اہمیت ہی کو نہیں سمجھتا۔ جب میں نے اسے مسلسل ٹوکنا شروع کیا، تو بولا:

"ضمیر میں بھی ایک مہاجر ہوں۔"

اس پر میں نے اسے فوراً جواب دیا: "تمہاری ہجرت اور ان لوگوں کی ہجرت میں فرق ہے، تم قیام پاکستان سے پہلے ہی یہاں آگئے تھے اور بخیر و عافیت پورے ساز و سامان کے ساتھ آئے تھے۔"

بہرحال اُس افسر نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ عوام اور خصوصیت کے ساتھ ان مہاجرین سے اخلاق کے ساتھ پیش آیا کرے گا۔" چنانچہ وہ اپنے وعدے کو نبھانے کے لئے لوگوں کے ساتھ بظاہر بڑے اخلاق سے پیش آنے لگا۔ گو اس کی یہ ظاہر داری نری عیاری معلوم ہوتی تھی، تاہم

میں برداشت کئے جا رہا تھا۔ آج مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے ایک مہاجر کو زمین اس شرط پر الاٹ کرادی کہ اس میں آدھا حصّہ اُس کا ہوگا۔ جب میں نے اُس سے پُوچھا،

اس آدھی زمین کے حقدار تم کس طرح بن گئے۔ تو اس نے جواب دیا،

"زمین کا الاٹ ہونا کون سا آسان کام ہے؟ علاوہ ازیں میں نے اس مہاجر سے یہ فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا اور وہ اس پر از خود راضی ہوا ہے۔ سودا کرنا یا آپس میں عہد و پیمان کرنا گناہ نہیں ہے۔"

مجھے ضمیر کے افسر دوست کا جواب کچھ زیادہ بُرا نہیں لگا۔ میں نے ضمیر سے کہا،

"تمہارے افسر دوست نے ایسی کون سی بات کہہ دی ہے جس پر تمہارا یہ حال ہوگیا؟"

یہ سنتے ہی ضمیر کے تن بدن میں آگ لگ گئی، بولا،

"یار تم بغیر سوچے سمجھے ایک بات کہہ ڈالتے ہو، تمہیں کیا معلوم، متروکہ جائداد اور اس کی الاٹمنٹ کا مسئلہ کس قدر اہم ہے، میں کہتا ہوں۔ اگر اس معاملے میں غفلت برتی گئی، تو نوبت نہ جانے کہاں تک پہنچے۔ آج میرے اس افسر دوست نے ایک مہاجر کا حق مار کر آدھی زمین خود رکھ لی اور آدھی اس غریب کو دی۔ کل کو دوسرے لوگ بھی اس کی پیروی کریں گے۔ آج یہ وبا ایک محکمے میں پھیلی ہے، کل کو لوگ ایک دوسرے کا کام ہی اس بنا پر کیا کریں گے کہ تم مجھے زمین الاٹ کرا کر دوگے، تو میں تمہارا کام کر دوں گا۔ جن کا حق ہوگا ان کو زمین ملے گی نہیں اور جو صاحبانِ اقتدار ہوں گے وہ لے جائیں گے آج تو اصل کلیم پر زمین الاٹ ہوتی ہے اور اس کے حصّے بخرے ہوئے ہیں، کل کو اصل کلیم دفتروں میں پڑے رہ جائیں گے اور جعلی بوگس کلیموں پر زمینیں الاٹ ہونے لگیں گی اور جائز حق دار غاصبوں کی طرف دیکھ دیکھ کر اپنی قسمت کو رویا کریں گے۔"

میں نے ضمیر کی اُکتا دینے والی تقریر سے تنگ آ کر کہا:

"ضمیر تمہیں خواہ مخواہ کے خطرات نے پریشان کر رکھا ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جعلی دستاویزات پر زمین الاٹ ہوا کرے گی۔ اور پھر تمہارا یہ کہنا، تو بالکل بجا اس ہے کہ اقتدار میں آنے والا ہر شخص

زمین الاٹ کرا سکے گا۔ تمہاری یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ ہر محکمے کے لوگ "زمیندار" بننے کی کوشش کریں گے۔"

ضمیر نے جواب دیا: "تم نے زر، زمین اور زن والی بات تو سُنی ہے، یہ تین چیزیں بڑی پُرکشش بھی ہیں اور ایک انسانی معاشرے کے فساد کی جڑ بھی۔ بس یُوں سمجھ لو ان تینوں چیزوں میں اصل چیز زمین ہے ـــــ زمین ہاتھ لگ جائے، تو باقی دونوں چیزیں یعنی زر اور زن خود بخود ہاتھ آجاتی ہیں۔ اب خود ہی غور کرو جب لوگوں کو زمین ملتی نظر آئے گی، وہ اسے کیسے چھوڑ دیں گے؟ اگر ایسا ہُوا تو یہ ہماری قومی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہوگا۔"

میں نے بات کو مختصر کرنے کے لئے ضمیر سے کہا: "یار، تم تو ہر بات کو المیہ بنا دیتے ہو، تمہارے ہاں کوئی طربیہ بھی ہے یا سب کچھ المیہ ہی المیہ ہے۔ میں تمہارے اس لفظ المیے سے بہت بور ہو چکا ہوں۔ سر اُٹھا کر چلنا المیہ، کُھل کر بیٹھنا المیہ، کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا المیہ، کسی سے آنکھیں چرانا المیہ۔ آخر تم نے اس لفظ کو کثرتِ استعمال سے بے معنی بنا ڈالنے کا عزم کس لئے کیا ہے۔ سب باتیں چھوڑو، یہ بتاؤ اپنے اس افسر دوست سے قطع تعلق تو نہیں کر آئے۔"

ضمیر نے کہا: "بالکل یہی ہُوا ہے ویسے میں نے اس سے ترکِ دوستی نہیں کیا بلکہ اس نے مجھے دُھتکار کر اپنے گھر سے نکالا ہے، وہ کہتا ہے میں نے تمہاری دوستی کی بدولت بہت نقصان اُٹھایا، اب مزید برداشت کرنے کی ہمّت نہیں، یہ زمانہ ضمیر سے دوستی کرنے کا نہیں، ضمیر کی دوستی آدمی کو ڈرپوک بنا دیتی ہے اور دنیا کو سمیٹنے کے لئے دل سے ہر قسم کا خوف نکال دینا نہایت ضروری ہے۔"

چند روز بعد میں نے ایک دن پھر ضمیر کو بہت اُداس دیکھا۔ اُداسی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا: "میرے ایک تاجر دوست نے بھی مجھ سے تعلقات ختم کر لئے ہیں۔"

میں نے کہا: "ذرا تفصیل سے بتاؤ۔"

ضمیر بولا: "میں اپنے اس تاجر دوست سے کہتا تھا کہ وہ خرید و فروخت میں ایمان داری سے

کام لے، لیکن اس کا کہنا تھا کہ ایمان داری سے کام لیا جائے، تو کچھ نفع نہیں ہوتا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی۔ آخر اس نے مجھے بتایا: "ضمیر صاحب، تمہارا افسر دوست ہی مجھے سب سے زیادہ بے ایمانی اور بددیانتی کے لئے مجبور کرتا ہے۔ اب بتاؤ میں کہاں جاؤں۔"

ضمیر نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا: "جب میں نے اسے مشورہ دیا کہ افسر دوست کو صاف انکار کر دو، تو اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور پھر آگ بگولا ہو کر کہنے لگا:

"ضمیر، میرے سامنے سے دُور ہو جا، میں تیرے کہنے پر زندگی کے سنگین حقائق سے آنکھیں نہیں چُراؤں گا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے افسر کو خفا کر کے میں اپنا کاروبار ایک روز کے لئے بھی برقرار نہیں رکھ سکتا۔"

ابتداء میں ضمیر نے اہلِ سیاست سے بھی دوستی بڑھانا چاہی تھی، لیکن اپنی تمام دانش مندی اور احتیاط کے باوجود اس ضمن میں وہ کوئی فیصلہ کُن قدم آج تک نہیں اُٹھا سکا۔ اس کا کہنا ہے، ان سیاست دانوں کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ جلسے جلوس بلکہ عام صحبتوں میں بھی وہ میری دوستی کا دم بھرتے نظر آتے ہیں لیکن میرے دل نے کبھی یہ گواہی نہیں دی کہ وہ فی الواقع میرے دوست ہیں، زبان سے خواہ کچھ کہتے رہیں، ان کے رویے سے یہی ظاہر ہوتا ہے جیسے ان کا ضمیر سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔

اس دن ضمیر کی بہت خراب حالت تھی جب اس کے ایک مزدور دوست نے اسے دُھتکار کر اپنے گھر سے نکال دیا ــــ مجھ سے کہنے لگا:

"مشکور بھائی، میرا خیال تھا پاکستان کے خواص نے مجھے نظر انداز کر دیا ہے، تو کوئی غم نہیں عوام تو میرے ساتھ ہیں، لیکن آج پتہ چلا عوام بھی ضمیر سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔"

اس دن کے بعد سے ضمیر اکثر میرے گھر کے دروازے پر پڑا رہتا اور اپنی مسلسل کھانسی سے اپنی موجودگی کا ثبوت دیتا رہتا۔ صحت مند ضمیر کی تو کڑوی کسیلی باتیں بھی میں جُوں توں برداشت کر لیتا تھا، لیکن بیمار ضمیر سے تو مجھے بھی نفرت ہو چلی تھی۔ میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوتا، ضمیر اپنی

طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا، کبھی خوشامد سے، کبھی منّت سماجت سے، کبھی غصّے سے، کبھی پیار سے، وہ مجھے اکثر کہتا،
"مشکور تم بھی مجھ سے دو منٹ کے لئے بات نہیں کر سکتے، مجھے بھی تو تھوڑا سا وقت دو، میری بھی تو سُنو کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔"
میں یوں ہی تکلّف میں لمحہ بھر کے لئے اس کے پاس کھڑا ہو کر کہتا "ہاں بھئی ضمیر کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"
ضمیر سمجھ جاتا کہ میں اسے ٹالنا چاہتا ہوں، فوراً کہتا ہوں "دیکھو، مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو، توجہ سے میری بات سُنو، اگر نہیں سُنتے تو اس تکلّف کی کوئی ضرورت نہیں۔"
میں بھی جل کر صاف صاف کہہ دیتا "یہ بات ہے تو میرے پاس تمہاری باتیں سُننے کے لئے کوئی وقت نہیں۔"
ضمیر زور زور سے کھانستے ہوئے خفگی کے عالم میں کہتا "غدّار کہیں کے، بے وفا، بے شرم، تو اگر مجھے اپنی توجہ کے قابل نہیں سمجھتا، تو میں بھی تجھ پر تھوکتا ہوں۔"
میں دل ہی دل میں سوچتا کہ یہ ضمیر بھی خوب ہے، بیکسی کے عالم میں پڑا ہے، کوئی اس کا پُرسانِ حال نہیں، لیکن اکڑتا ایسے ہے جیسے نامعلوم کسی ملک کا شہزادہ ہے۔
ایک طرف تو ضمیر سے قریب قریب تمام دوستوں نے قطع تعلق کر لیا، دوسرے اس کی بیماری بھی طویل ہو گئی۔ ضمیر سارا دن میری ڈیوڑھی میں پڑا کھانستا رہتا۔ مجھے اس کے وجود سے کراہت آنے لگی ــــ میں اکثر سوچتا نہ یہ کم بخت مرتا ہے اور نہ میرا پیچھا چھوڑتا ہے۔ ایک دن تنگ آ کر کہا:
"ضمیر کبھی باہر کی تازہ ہوا بھی کھا لیا کرو۔"
ایک دم بجلی کی طرح کڑک کر بولا: "اچھا تمہیں میرا خیال آ ہی گیا، لیکن تم نے یہ بھی سوچا، میں کہاں جاؤں، باہر نکلتا ہوں، تو لوگ مجھ سے اس طرح دُور بھاگتے ہیں جیسے میں کسی متعدّی بیماری میں مبتلا ہوں یا کوئی بھوت پریت ہوں کہ انہیں نگل جاؤں گا۔"

میں نے ضمیر کو سمجھانے کے طور پر کہا: "تم نے اپنی یہ حالت خود بنائی ہے، آخر دنیا بھر کو نصیحت کرنے کا ٹھیکہ تمہی نے اٹھایا ہے"

ضمیر نے جواب دیا: "دوست میں کسی کو کچھ نہیں کہتا اور نہ کسی سے کچھ مانگتا ہوں، میری تو ایک ہی درخواست ہے کہ کوئی ذرا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ لے، میں صرف ایک نگاہ کا طالب ہوں"

میں نے قصّہ مختصر کرنے کے لئے کہا: "یہ کون سی بڑی بات ہے، لاؤ میں تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ لیتا ہوں"

ضمیر کی باچھیں کھل گئیں، یوں محسوس ہوا جیسے اسے دوبارہ زندگی مل گئی ہے، کہنے لگا: "سچ مچ مشکور، تم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو گے"

میں نے جواب دیا: "اور کیا میں مذاق کر رہا ہوں؟"

"تم بالکل تیار ہو"

"بالکل"

"خبر نہیں مشکور، مجھے یقین کیوں نہیں آ رہا"

"اوہو بھئی، تم نگاہیں اُٹھا کر تو دیکھو"

ضمیر نے میری طرف نگاہیں اُٹھا کر دیکھا۔ میں مشکل سے ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں جھانک سکا۔ میں نے چیخ کر کہا:

"خدا کے لئے ضمیر اپنی آنکھیں بند کرو"

اُف، اس ایک لمحے میں مجھے یوں لگا جیسے میں نے اب تک دُنیاوی کامیابی کے لئے جو کچھ کیا ہے، وہ سب لغو اور بے کار ہے۔ میں نے مکان کیوں بنوایا؟ میں نے زمین الاٹ کیوں کرائی میں اس زمین پر ٹیوب ویل کیوں لگوا رہا ہوں؟ مجھے گاڑی خریدنے کی ہوس کیوں ہے؟ میں عمدہ اور قیمتی لباس پہننے کی تمنا کس لئے کرتا ہوں؟ میرے کتنے ہم وطنوں کے پاس میرے جیسا مکان

ہے ! میرے کتنے ہجرت کرنے والے بھائیوں کو ان کے حق کی زمین الاٹ ہوگئی ہے ؟ میرے کتنے دوست احباب اور عزیز و اقارب ہیں جن کے پاس سواری کے لئے سائیکل بھی موجود ہے ؟ میں نے محسوس کیا، ضمیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا خود کو زندگی کے حقائق سے دُور رکھنے کے مترادف ہے۔ ضمیر مجھے حقائق کی دُنیا سے نکال کر خیالوں کی دنیا میں لے جانا چاہتا ہے۔ یہ مجھے نکما اور نکھٹو بنانے کا آرزو مند ہے، ہر زمانے کی حقیقت مختلف ہوتی ہے۔ آج کی حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کو بے وقوف بناؤ، ان کا حق مارو، دوسروں کو گرا کر خود آگے بڑھتے جاؤ، اپنی ذات کو سب سے اوّل رکھو اور ضمیر کہتا ہے کہ

" دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو "

ضمیر بکواس کرتا ہے، میں نے ضمیر سے مخاطب ہو کر کہا:

" ذلیل، کمینے، تُو اپنی آنکھوں کے ذریعے مجھے ہپناٹائز کرنا چاہتا ہے، ہپناٹزم جادُو ہے اور جادُو کی اسلام میں سخت ممانعت ہے "

ضمیر نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا "مشکور، اسلام کو کیوں بدنام کرتے ہو، اسلام کا تم سے کیا واسطہ؟"

مجھے ضمیر کے اس جواب پر یک لخت غصہ آگیا" اچھا، اب تُو میرے مذہب اور دین پر بھی چوٹ کرتا ہے۔ میں اوّل و آخر مسلمان ہوں۔ تھوڑی سی رشوت، مکاری، جھوٹ اور خود غرضی سے میری مسلمانی میں کیا فرق آجائے گا ! یہ سب چیزیں وقت کا تقاضا ہیں، کون ہے جو میرے مسلمان ہونے میں شک کر سکتا ہے ؟ اور تُو ہے کہ مجھے کہتا ہے میرا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں " یہ کہہ کر میں نے ضمیر کو خوب زدوکوب کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ ضمیر کے ہزار چیخنے چلّانے کے باوجود کوئی اس کی مدد کے لئے نہیں پہنچا۔ میں نے جی بھر کر ضمیر کو پیٹا اور پھر اسے گھسیٹتا ہوا دروازے کے باہر ڈال آیا۔

اس دن سے ضمیر میرے گھر کے سامنے سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا ہے۔ ہر آنے جانیوالے راہ گیر سے یہی کہتا ہے:

"بھائی مجھے تمہارے مال و دولت کی ضرورت نہیں، صرف ایک نگاہ کی بھیک مانگتا ہوں، بس ایک بار میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ لو"

لیکن کوئی اس کی اس آواز پر غور نہیں کرتا۔ ہمارے معاشرے کا ہر فرد اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ ضمیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا اپنے آپ کو ناکارہ کر دینے کے مترادف ہے

لیکن ابھی چار پانچ روز کی بات ہے، ہمارے ایک پڑوسی ٹھیکدار صاحب کے لڑکے نے ضمیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا، قیامت ہی تو برپا ہوگئی۔ وہ لڑکا فوراً اپنے گھر آیا، کہنے لگا:

"امی، ابو حرام کھاتے ہیں، وہ جن کاموں کا ٹھیکہ لیتے ہیں، انہیں صحیح طور پر نہیں بنواتے۔ اس لڑکے کی ماں بولی: "ارے بیٹے، یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے، کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو"

اس لڑکے کی ماں چپ ہوئی تو وہ اپنے پروفیسر چچا پر برس پڑا: "معاف کیجئے چچا جان اب اساتذہ بھی دیانت داری ختم کرتے جا رہے ہیں، چلیے آپ کچھ پڑھا لیتے ہوں گے اور خود بھی شاید کبھی کبھار پڑھ لیتے ہوں گے، لیکن حق بات کہنے کی آپ لوگوں میں ابھی تک جرأت پیدا نہیں ہوئی اُستاد بھی ڈرتے ہوں، تو غریب طلباء کہاں جائیں"

چچا سے لڑ جھگڑ چکا، تو اپنے ایک ہمسائے کے گھر چلا گیا، وہاں اس سے تُو تُو مَیں مَیں ہوگئی لڑکا اس ہمسائے سے کہہ رہا تھا: "چچا جی، آپ کا اتنا بڑا بزنس ہے لیکن ایمان داری سے دیکھئے تو اس میں حلال کا روپیہ بہت کم ہوگا۔ آپ کی بیشتر دولت بے ایمانی کا نتیجہ نظر آتی ہے" اسی طرح پھر وہ ایک لیڈر سے دست و گریباں ہوگیا۔

غرض تمام محلّہ اس لڑکے سے تنگ آگیا۔ اس کے پاس جو کوئی بھی جاتا، اس کی خبر لیتا، اس کا بار بار یہی کہنا تھا کہ ہم میں ہر کوئی بے ایمان ہے۔ آخر محلّے والوں نے پریشان ہو کر ٹھیکدار صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنے لختِ جگر کو پاگل خانے میں داخل کرا دیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بڑی کوششوں اور سفارشوں کے بعد اسے داخلہ مل گیا، کیونکہ متعلقہ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ اس لڑکے

کو کچھ نہیں ہوا، اس کا دماغ بالکل صحیح ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جب اس کی صحت دماغی پر بہت اصرار کیا، تو ہمارے محلّے کے لوگوں کو ان ڈاکٹر صاحب پر شک ہونے لگا کہ کہیں یہ حضرت خود بھی پاگل تو نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جب دیکھا کہ لوگ خود انہیں پاگل سمجھنے پر تیار ہو چلے ہیں، تو کچھ اپنی ملازمت کے خوف سے اور کچھ سفارشوں کے دباؤں سے اس لڑکے کو داخل کر ہی لیا۔

لوگوں کو جب اس مصیبت سے نجات ملی، تو وہ سر جوڑ کر بیٹھے اور غور کرنا شروع کیا، آخر یہ لڑکا کیسے پاگل ہوا ——؟ پتا چلا اس نے ضمیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا۔ فوراً سب نے فیصلہ کیا کہ ضمیر کو شہر سے کہیں دُور جنگل میں پھینک آیا جائے۔ جس وقت ہمارے محلّے کے لیڈروں اور تجارت پیشہ حضرات کو اس فیصلے کی خبر ہوئی تو انہوں نے بے حد خوشی کا اظہار کیا، بلکہ یہ پیش کش بھی کی کہ ضمیر کو شہر بدر کرنے کا خرچ بھی وہ اپنی جیب سے ادا کریں گے۔ اتفاق سے ان لیڈروں کے پاس ایک بہت بڑے لیڈر بھی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ بھائیو، کچھ سوچو سمجھو، ضمیر کو صرف شہر بدر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، اسے ملک بدر کیا جائے تاکہ پوری قوم اس کے بُرے اثرات سے محفوظ رہ سکے۔ ان لیڈر صاحب کی اس تجویز کی نہ صرف ہمارے تمام محلّے والوں نے بیک زبان تائید کی، بلکہ ملک کے بڑے بڑے اخباروں میں بھی اس تجویز کو جلی حروف کے ساتھ شائع کیا گیا۔

جس وقت میرے گھر کے سامنے سے ضمیر کی ہڈیوں کے ڈھانچے کو ملک بدر کرنے کے لئے اُٹھایا جا رہا تھا، عین اسی وقت ہمارے ایک دوست صدیق سالک آ گئے۔ کہنے لگے:

"بھائیو، آپ کس کو ملک بدر کر رہے ہیں، ضمیر ہم میں ہے کہاں؟ یہ تو بہت پہلے کا مر چکا ہے۔"

لوگوں نے غم و غصّے کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا: "تم جھوٹ کہتے ہو، اچھی طرح دیکھو، ابھی اس میں سانس باقی ہے۔"

اور واقعی ضمیر کو جب گاڑی میں ڈالنے لگے تو اس نے بڑی بلند آواز میں چیخ کر کہا:

"اے لوگو، میں تم سے اور کچھ نہیں مانگتا، صرف ایک نگاہ کا طالب ہوں، زیادہ نہیں لمحہ بھر کے لئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ لو، بس ایک لمحے کے لئے ایک لمحے کے لئے؟"
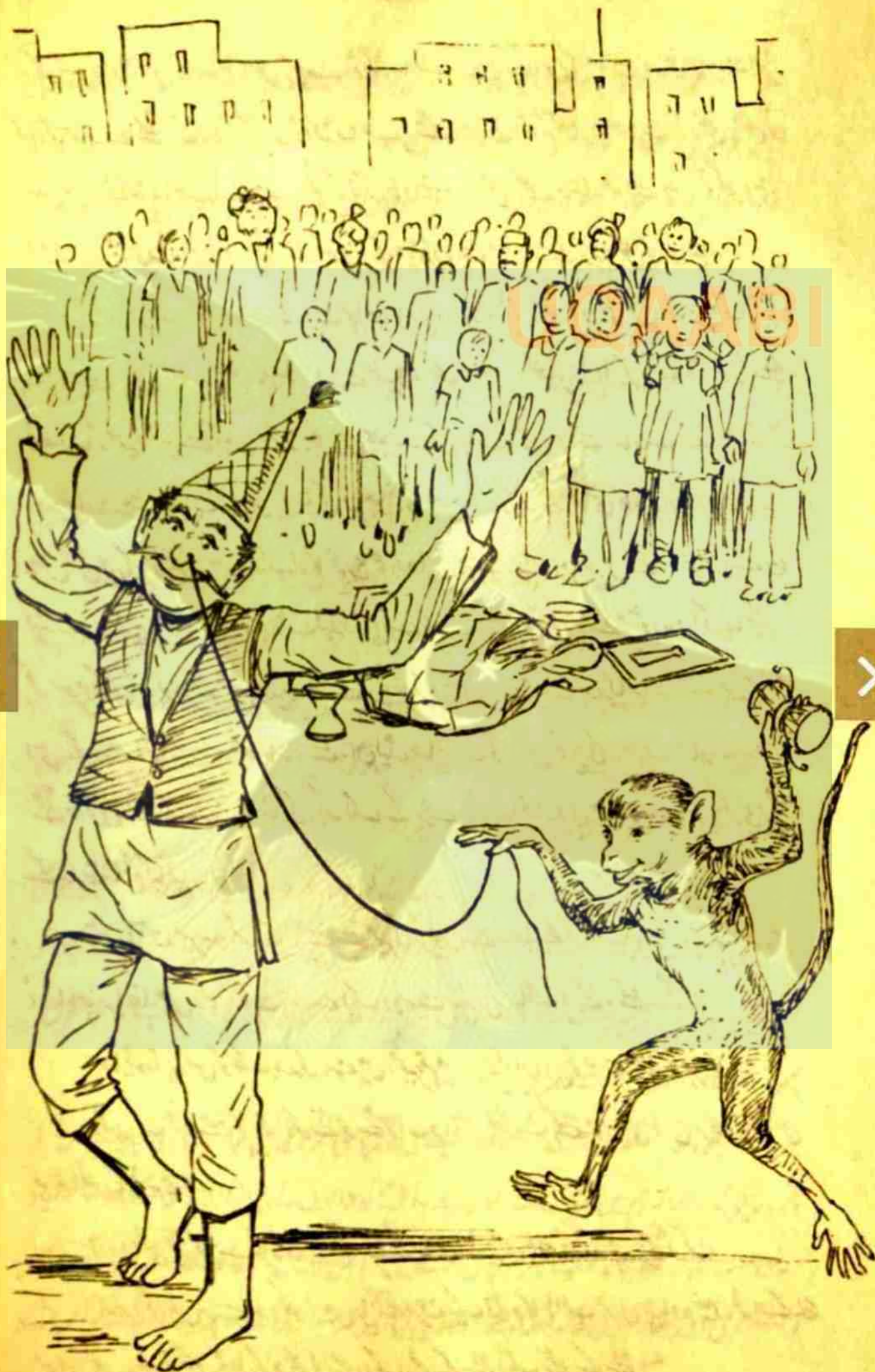
تقدیر کا چوپال

"بھوں.... بھوں"

"جیکی!"

"بھوں بھوں..... بھوں بھوں..... بھا!"

"جیکی تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ اپنے مالک کو بھی نہیں پہچانتے ؟"

"بھاؤں بھاؤں بھا..... بھاؤں بھاؤں بھا!" میرا وفادار کتا مسلسل بھونکتا چلا گیا اور اس نے مجھے بڑی مشکل سے مکان میں داخل ہونے دیا۔ میں سمجھا یہ پاگل ہوگیا ہے۔ گھر کے اندر آیا تو کیا دیکھتا ہوں ڈھیلے بادشاہ میرے بستر پر دراز ہیں۔ تن بدن میں آگ بھی تو لگ۔ چلا کر کہا: "بدتمیز کہیں کے۔ تجھے یہ کیسے جرأت ہوئی کہ میری مسہری پر آکر لیٹ گیا!"

اس نے اکڑ کر جواب دیا: "ڈھی چوں۔ ڈھی چوں!"

"اٹھتا ہے یا ڈنڈے سے تیری خبر لی جائے!" میرے یوں کہنے پر ڈھیلے بادشاہ نے ڈھیلا ہونے کے بجائے اس زور سے ڈھی چوں ڈھی چوں کے پانچ چھ نعرے لگائے کہ میں سمجھ گیا اگر میں نے مزید چوں وچرا کی تو اس زور کی دولتی آئے گی کہ میرا بھیجا اڑ جائے گا۔ پھر بھی میں نے حوصلے سے کام لیتے ہوئے کہا:

"ڈھیلے بادشاہ اپنی اصلیت نہ بھولو۔ آخر گدھے ہو۔ گدھا لوٹن تو ایک مشہور چیز ہے۔ جو لطف زمین میں لوٹ لگا کر آتا ہے وہ اس نرم بستر میں کہاں!"

اس جملے پر ڈھیلے بادشاہ نے اس غضب ناک انداز میں دیکھا اور اپنی تھوتھنی یوں ہلائی کہ مجھے صاف طور پر پتہ

چل گیا اگر میں اب کچھ اور بولا تو سمجھو میری خیریت نہیں۔ ڈھیلے بادشاہ میرا نہایت سلیس قسم کا گدھا تھا، لیکن اس وقت اُس کے انداز بتا رہے تھے کہ مسٹر، میں نے بہت دن تمہارے ظلم سہہ لیے۔ بہت دن خاک پھانک لی۔ اب تمہاری باری ہے۔ زمین پر تم لوٹ لگاؤ۔ بستر پر ہم آرام فرماتے ہیں۔ گوڑی پر جا کر تم تلاشِ معاش کرو۔ کھانے کے کمرے میں بیٹھ کر ہم کھانا تناول فرمائیں گے۔"

میں نے سوچا گدھا پھر گدھا ہے۔ بزدستی تو مشہور ہے۔ وقتی طور پر اس کا دل مچل گیا ہے۔ کوئی بات نہیں اپنے آپ اُٹھ کھڑا ہو گا۔ چنانچہ اس خیال کے تحت ڈھیلے بادشاہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر میں باہر صحن میں آ گیا۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ جیسے ہی میرے قدم صحن میں دکھائی دیتے مرغیاں بھاگ کر میرے پاس آتیں، لیکن آج خلافِ معمول وہ اپنی اپنی جگہ کچھ اس طرح کھڑی تھیں جیسے مجھ سے سخت ناراض ہیں۔ البتہ بہادر مرغے نے ککڑ کڑا کی آواز ضرور بلند کی لیکن اُس میں بھی محبت کی جگہ نفرت اور غصّے کا اظہار زیادہ تھا۔ انڈا دیکھنے کے لیے میں نے ڈربے میں ہاتھ ڈالا۔ نیلم پری نے میرے ہاتھ پر اس زور سے چونچ ماری کہ میں بے تاب ہو کر رہ گیا۔ اُدھر باہر سے بہادر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ دوسری مرغیاں بھی مجھے گھیرے میں لینے کے لیے باقاعدہ پیش قدمی کر رہی تھیں۔ سب ایک زبان ہو کر کہہ رہے تھے: "تم انڈے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا: "کیوں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ انڈا ہم سے ہے، ہم انڈے سے ہیں۔ انڈا ہماری دولت ہے، ناموس ہے، عزت ہے۔ تم انڈے کے کیا لگتے ہو؟"

"لیکن پہلے تو۔۔۔"

"پہلے کی بات چھوڑو۔ بہت دن ہماری قطعِ نسل کرتے رہے ہو۔ اب ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔"

"مگر اے میری پیاری مرغیو اور اے میرے بہادر مرغ! ذرا سوچو تو سہی۔"

"ہمیں سوچنے کی تلقین کرتے ہو۔ کبھی خود بھی سوچا ہے۔ انصاف سے کہنا۔ کیا انڈا ایسا موضوع ہے جس پر اس بے حیائی سے گفتگو کی جائے۔"

"مگر"

"مگر وگر کچھ نہیں ۔انڈا کھانا یا اُسے ہاتھ لگانا تو در کنار تم اسے دیکھ بھی نہیں سکتے۔" مجھے مرغیوں کے اس استدلال پر ہنسی آگئی ۔ بہادر مرغا ایک جست لگا کر میرے سامنے آیا اور کہنے لگا "خبردار جو ہمارا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ ایسا پنجہ ماروں گا کہ بتیسی باہر نکل آئے گی ۔ جو سلوک تم ہمارے انڈے بچوں کے ساتھ کرتے چلے آئے ہو اگر وہی سلوک ہم تمہاری اولاد سے کریں تو خود بتاؤ تمہارا کیا حال ہو۔"

میں بہادر مُرغے کی اس گفتگو پر کانپ اٹھا اور موضوع بدلتے ہوئے بولا "اور سناؤ بہادر میاں، تمہارے مزاج کیسے ہیں۔ ہم تو تمہیں اپنا عزیز سمجھتے ہیں ۔ اللہ جب تک تم نظر نہیں آتے دل بے چین رہتا ہے۔ سچ پوچھو تو تمہیں اور تمہاری مرغیوں کو دیکھ کر ہم جیتے ہیں۔" بہادر نے جب دیکھا کہ ہم مرعوب ہو چلے ہیں اُس نے مرغیوں کو آنکھ ماری اور وہ چشم زدن میں اڑ کر مجھ پر وارد ہو گئیں۔ کوئی میرے کاندھے پر چڑھ گئی۔ کوئی کمر پر اور کوئی زانو پر۔ اور لگیں اظہار محبت کرنے۔ کبھی میرے کان میں چونچ دے کر کو کو کرتیں، کبھی میری ناک کے نتھنوں میں چونچ ڈبو کر گنگنانے کی کوشش کرتیں، کبھی میرے ہونٹ چومنے کی سعی فرماتیں۔ مرغیوں کے ان چونچلوں سے میری طبیعت خاصی خراب ہو چلی تھی، لیکن بظاہر ہنس رہا تھا اور کہتا جاتا تھا "میری پیاری مرغیو اس قدر پیار اچھا نہیں۔ بھئی ہم ناراض ہو جائیں گے۔ ارے یہ کیسا لاڈ ہے۔ میری تو آنکھ ہی پھوٹ چلی تھی۔" کیا کہا میری آنکھوں کا مُیل تمہیں بہت مزیدار لگتا ہے۔ لاحول ولا قوة۔ آخر مُرغی ہی ثابت ہوئی نا۔" "یہ بات ہے تو ہمیں موتی کھلا دیجئے۔" ایک مُرغی بولی۔ اس ہنگامے میں بہادر کو کیا سوجھی کر اعلانِ فتح کے طور پر میرے سر پر بیٹھ کر اذان دینے لگا۔ مرغیوں کے اس لاڈ چاؤ سے میں سخت تنگ آچکا تھا۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا۔ ڈیوڑھی کے قریب آیا تو کیا دیکھتا ہوں جانِ عالم اپنے لختِ جگر کو دودھ پلا رہی ہے۔ بہت غصہ آیا۔ طیش میں آ کر کہا۔

"اری کم بخت، تجھے میرے معصوم بچوں کا ذرا خیال نہ آیا اور اپنے دل کے ٹکڑے کو جی بھر کر دودھ پلا رہی ہے۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو جی۔ بہت دن میں نے تمہارے بچوں کو دودھ پلایا۔ آخر میرے پیارے کٹے میاں کا بھی مجھ پر کوئی حق ہے۔" جانِ عالم نے جواب دیا۔

"اللہ کی شان! ایک حقیر بھینس بھی اس طرح بات کرتی ہے!"

"بھینس اگر ایسی ہی حقیر چیز ہے تو پھر آپ اس کے لئے کاہے کو پریشان ہو رہے ہیں!" میری بھینس جانِ عالم نے ابھی اپنا فقرہ پوری طرح ادا نہ کیا تھا کہ اُس کے برخوردار نے دودھ چھوڑ کر میرے پیٹ میں اس زور سے سر مارا کہ میں تڑپ کر رہ گیا۔ ابھی اس تکلیف سے سنبھلنے نہ پایا تھا کہ جانِ عالم نے اپنی دُم کا چابک میرے منہ پر رسید کیا۔ مجھے دن میں تارے نظر آنے لگے۔ جانِ عالم کو خوش کرنے کے لئے بنولے، کھل اور چوکر لے کر آیا، لیکن اُس نے اُسے منہ تک نہ لگایا کہنے لگی: "جناب! یہ کھانا تو ہمیں روز ملتا ہے!"

"پھر کیا کھانا چاہتی ہو ـــــ جانِ عالم!" میں نے سراپا انکسار ہو کر پوچھا۔

"زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں فی الحال آپ مجھے پانچ چھ سیر سوہن حلوہ کھلا دیجیے"

"سوہن حلوہ؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"افسوس! انسان بھوک میں حیوانوں کی خوراک کھالیں تو کسی کو حیرت نہ ہو اور ایک بھینس خوشی میں سوہن حلوے کا مطالبہ کر بیٹھے تو آپ حیرت میں آجائیں!"

"دیکھو نا جانِ عالم! اس وقت سوہن حلوہ کہاں سے لا سکتا ہوں۔ کوئی اور فرمائش کرو۔ تم میری اتنی خوبصورت اور پیاری بھینس ہو۔ اُمید ہے تم مجھے پریشان نہ کرو گی"

اپنے حُسن کی تعریف سُن کر جانِ عالم قدرے شرمائی اور ایک ادائے خاص سے پچھلی ٹانگوں پر کود کر اور دُم کو فضا میں لہرا کر بولی۔ "تو پھر ایسا کیجیے میرے ہونٹوں پر سُرخی لگا دیجیے"

"سُرخی؟ جانِ عالم! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"اجی جناب! مجھے کچھ نہیں ہوا آپ ہی تنگ نظر واقع ہوئے ہیں۔ ذرا غور کیجیے آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی بیگم خوبصورت دکھائی دیں اور میرا شوہر سانڈ جو آپ سے یقیناً توانا اور خوبصورت ہے اُس کے سامنے میں بن سنور کر نہ آؤں۔ شاید آپ میں یہ بات سننے کی ہمت نہ ہو کہ میں آپ کی بیگم سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوں۔ اصل حُسن تندرستی ہے اور مقابلہ کر کے دیکھ لیجیے میری صحت آں محترمہ سے لاکھ درجے بہتر ہے!" جانِ عالم ابھی یہ باتیں کر ہی رہی تھی کہ اُس کے نورِ چشم نے میری پتلون چبانا شروع کر دی۔ میں نے کٹّے کے منہ پر ہاتھ مارا تو جانِ عالم کہنے لگی۔

"آپ سمجھے بھی میرا برخوردار کیا چاہتا ہے؟"

"اس کی بھی کوئی فرمائش ہے؟"

"جی ہاں، یہ کہتا ہے کہ اسے سوٹ سلوا کر دیجیے؟"

"یعنی کتا سوٹ پہنے گا؟"

"چلیے سوٹ نہ سہی پتلون ہی بنوا دیجیے۔"

"جانِ عالم! کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ کتا اور پتلون؟"

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ جب آپ کے بچے میرے کتے کی طرح ننگے پھر سکتے ہیں تو میرا کتا آپ کے بچوں کی طرح پتلون کیوں نہیں پہن سکتا؟"

میں سخت پریشان تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا معاملہ ہے۔ چنانچہ گھبراہٹ میں دیوار پھاند کر باہر آگیا۔ دیوار مجھے اس لیے پھاندنا پڑی کہ جیکی مسلسل بھونک رہا تھا۔ شاید وہ مجھے ابھی تک نہیں پہچان سکا تھا اور اگر پہچان چکا تھا تو اُس کا بھی کوئی مطالبہ ہوگا۔ غالباً یہ کہ میں اُس کی طرح بھونک بھونک کر چوکیداری کروں اور جب کوئی نظر آئے تو دُم ہلا ہلا کر اُس کے پاؤں چاٹوں۔ اور وہ خود گھر میں مالکِ مکان کی حیثیت سے چہل قدمی فرمائے۔ مجھ گلی میں بچے جمع تھے کوئی تماشا ہو رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ ایک بندر ہے اور ایک قلندر۔ بندر کے ہاتھ میں ڈگڈگی ہے اور بچے بندر سے کہہ رہے ہیں "بندر بھیا! اپنے قلندر کو نچا کر دکھاؤ۔ ہم تمہیں روٹی بھی دیں گے اور پیسے بھی۔" بندر نے قلندر کی ناک میں نکیل ڈال رکھی تھی۔ اُسے کھینچ کر کہنے لگا "ناچ بیٹا قلندر!" میں نے دیکھا قلندر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔ بندر نے شیر کی طرح گرج کر کہا "ناچتا ہے یا تجھے اس گستاخی کا مزہ چکھاؤں۔ ہم ازل سے تیرے اشاروں پر ناچتے چلے آئے ہیں۔ اب تیرے ناچنے کی باری آئی ہے تو اس طرح جان بچا رہا ہے۔" قلندر ناچنے لگا تو بندر پھر بولا "اپنے کاندھے پر لاٹھی رکھنا کیوں بھول گیا۔ اور کیا سسرال جاتے وقت منہ لٹکائے جاتے ہیں؟ خوش خوش قدم اٹھا ورنہ میری نانگ اس طرح کاٹ کھاؤں گا کہ پھر تجھے عمر بھر چلنا نصیب نہ ہوگا۔" کھیل ختم ہونے لگا تو بندر نے اعلان کیا "کوئی بچہ اپنی جگہ سے پیسے اور روٹی دیئے بغیر نہ ہلے۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو اسی وقت اُس کی گردن سے خون چوس لیا جائے گا۔" ایک بچے نے تو کی زبان

میں جواب دیا:

"بندل بھائی! پہلے پاس تو کوئی پیسہ نہیں۔ روٹی بھی نہیں۔ روٹی تو ہم نے کل سے نہیں کھائی"

"پھر تو تماشا دیکھنے کے لئے کیسے آگیا؟"

"پہلے تو یہ آدمی جسے تم نچا رہے ہو غریب بچوں سے کوئی پیسہ نہیں لیا کرتا تھا۔ مفت تماشا دکھاتا تھا"

"او بیوقوف بچے! وہ آدمی تھا اور بندر کا تماشا دکھاتا تھا۔ میں بندر ہوں اور آدمی کا تماشا دکھا رہا ہوں۔ یہاں پہلے والی بات نہیں چلے گی۔ پیسے بھی دے اور روٹی بھی۔ ورنہ خون چوسوانے کے لئے اپنی گردن تیار رکھ۔ تیرا خون تو ویسے بھی بہت ذائقے دار ہوگا!"

بندر کا یہ مکالمہ سن کر میں چپکے سے کھسک گیا، کیونکہ اس وقت میرے پاس دینے کو کچھ نہ تھا۔ میں خوف سے لرز رہا تھا۔

سڑک پر آکر کیا دیکھتا ہوں کہ نظام دین تانگے والا تانگے کے آگے کھڑا گھوڑے کے بجائے خود ساز پہننے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کا گھوڑا تانگے میں آدھا بیٹھا اور آدھا کھڑا ہے۔ نظام دین سے میں نے کہا۔

"میاں یہ کیا ہو رہا ہے"

"کیا بتاؤں بابو جی، گھوڑا کہتا ہے تم تانگے میں جتو اور میں اس میں بیٹھتا ہوں"

"تم نے اسے کچھ کھانے کو نہ دیا ہوگا"

"یہ بات نہیں۔ سالا کہتا ہے گھاس نہیں کھاؤں گا۔ اگر کچھ کھلانا ہی چاہتے ہو تو دو چار سیر زعفران کھلا دو۔ آپ خود ہی بتائیں بابو جی، میں اسے زعفران کس طرح کھلا سکتا ہوں"

نظام دین کی بات پر گھوڑے نے کان کھڑے کئے خصوصاً جب اس نے اسے سالا کہا تو وہ زور سے ہنہنایا اور اگلا پاؤں اس زور سے تانگے پر مارا کہ سامنے کی تختی نظام دین کے سر میں آکر لگی۔ میں نے نظام دین سے پوچھا آخر یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ میرے گھر کے جانوروں کے رویے میں بھی زبردست تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ پھر اسے بندر کا حال بھی سنایا۔ نظام دین نے میری طرف حیرت سے دیکھ کر کہا:

"بابو جی! آپ بھی اچھے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اپنے اردگرد کے حالات کی آپ کو ذرا بھی خبر نہیں۔ اجی جناب!

تقدیر کے چوپال میں تمام جانوروں کے نمائندے طلب کئے گئے ہیں اور جب سے نمائندوں کا چناؤ عمل میں آیا ہے یہ سب اپنے آپے سے باہر ہوئے پھر رہے ہیں" نظام دین کچھ دیر توقف کے بعد پھر بولا "ویسے میں سمجھتا ہوں جہاں تک نمائندوں کی طلبی کا سوال ہے، یہ بہت اچھا ہوا ہے۔ سچ پوچھئے تو جانوروں سے بہتر تقدیر کو صحیح طور پر برتنے والا ہو بھی کون سکتا ہے؟ خدا کے ہاتھوں سے نکل کر تقدیر کا چوپال کے جانوروں کے ہاتھوں میں آنا ایک نیک شگون ہے" میں نے جب دیکھا نظام دین کی باتوں میں فلسفہ کچھ زیادہ ہی آچلا ہے تو اس کی گفتگو کو درمیان میں چھوڑ کر اس کے گھوڑے سے مخاطب ہو کر بولا "کیوں محترم گھوڑے صاحب، آپ نے کسے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے"

"قاضی صاحب کے بچھڑے کو"

"ارے وہ تمہاری نمائندگی کیا خاک کرے گا۔ بالکل ناتجربہ کار ہے"

"نیا خون ہے کم از کم اچھل کود تو اچھی طرح کرے گا"

"باہر اچھلنا کودنا آسان ہے۔ ٹھکانے کی جگہ یہ کام بھی ہر ایک کے بس کا نہیں ہوتا" میرے اس جواب پر گھوڑے نے ناراض ہوتے ہوئے کہا "چلیے کچھ نہیں کرے گا ہنہنائے گا تو سہی، لید تو کرے گا" "دکھ کی بات تو یہی ہے کہ لوگوں کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ گھوڑا ہنہناتا کس طرح ہے اور اس کی لید کس قدر خطرناک ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ایک بنگلے میں میرا گزر ہوا۔ سامنے سے جب ایک اور گھوڑی گزری تو میں بے اختیار ہنہنا اٹھا۔ اسی عرصے میں میری لید بھی نکل گئی۔ بنگلے کے بچے میرے پاس کھڑے تھے۔ اپنے باپ سے مخاطب ہو کر بولے "ڈیڈی دیکھو یہ جانور دادا جان کی موٹر کی طرح سٹارٹ ہوتا ہے" میری لید کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "اور دیکھئے یہ تو سونا اگلتا ہے" باپ نے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا "بچو! اسے ہاتھ نہ لگانا یہ بہت بری چیز ہوتی ہے" بچے بولے "نہیں ڈیڈی ہم اسے پلیٹ میں رکھ کر امی کو دکھائیں گے۔ انہیں سونے سے بہت محبت ہے وہ کہتی ہیں سونا جہاں بھی نظر آئے اسے فوراً اٹھا لینا چاہیئے"

نظام دین کے سرکش گھوڑے کی بالغ نظری پر میں حیران ہو رہا تھا کہ بکریوں کا ریوڑ آتا دکھائی دیا۔ یہ ریوڑ چرواہے کے بغیر تھا۔ بکریاں اور بکرے ناچتے ہوئے آ رہے تھے۔ میں نے گھوڑے سے مسکراتے ہوئے پوچھا:

"ان کا بھی کوئی لیڈر نکل آیا ہے؟"

"کیوں نہیں! انہوں نے حاجی میٹھا کی بکری کو اپنا راہبر بنایا ہے۔"

"ارے وہ تو ۔ ۔ ۔ ۔" میں اپنا جملہ پورا کرنے نہ پایا تھا کہ گھوڑا بولا: "جی مجھے معلوم ہے۔ وہ پوست کھاتی ہے۔ نشہ کرتی ہے۔ اور بڑی رنگین مزاج ہے۔ اس کے باوجود بکرے بکریوں کا کہنا ہے کہ ہمیں اس کے ذاتی کردار سے کیا لینا۔ اس نے ہمیں بیدار کیا ہے۔ ایک نعرہ دیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا نعرہ دیا ہے؟"

گھوڑا بولا۔

"ایک دن چند بکرے بکریاں اپنے گاؤں کے ٹیلے پر بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے کہ حاجی میٹھا کی بکری لنگڑاتی ہوئی آئی غالباً کسی بات پر حاجی صاحب نے اسے مارا ہوگا۔ اس نے آتے ہی ذرا اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر رُندھی ہوئی آواز میں ایک مختصر سی تقریر کی اور کہا: "دوستو! ہم نے بہت دن "مَیں مَیں" کر لی اب "ہم ہم" کرنے کا زمانہ ہے "مَیں مَیں" نے ہمیں تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔ "ہم ہم" ہمیں متحد کر دے گی۔ اس تباہی سے بچائے گی۔ اب ہم سب ایک ہیں۔ لیجئے صاحب اُس دن سے حاجی میٹھا کی بکری ان کی لیڈر ہے" گھوڑے نے تقریر کرتے ہوئے رُک کر کہا۔ "میرا گلا خشک ہو گیا ہے۔ آپ ایک جام وہسکی کا عنایت فرمائیں تو میں کچھ اور عرض کروں" میں نے نہایت عجز سے عرض کیا: "جنابِ محترم گھوڑے میاں! آپ کا یہ خادم ضرور خدمت انجام دیتا، لیکن افسوس کہ آج تک شراب کو منہ نہیں لگایا۔" گھوڑے نے اس جواب پر مجھے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا "مسٹر! میں خیال کرتا تھا آپ وسیع الخیال واقع ہوئے ہیں یہ سن کر کہ آپ پیتے نہیں میری نظروں میں آپ کی تمام عزت خاک میں مل گئی ہے۔ اُسے بھی کوئی جینے کا حق ہے جو شراب نہیں پیتا۔"

"گھوڑے صاحب! مجھے آپ کی رائے سے سو فی صد اتفاق ہے، مگر کیا کیا جائے کہ رسوائی علوت ثانیہ بن چکی ہے۔"

"اچھا اگر شراب نہیں تو ایک ہلکا بھنگ ہی پلا دیجئے مگر یاد رہے نہایت اعلیٰ قسم کی ہو۔"

"جناب والا، میں بھنگ بھی نہیں پیتا"۔ میرے اس جواب پر گھوڑا تانگے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ بھنگ بھی نہیں پیتے تب تو آپ کی زندگی قابلِ نفرت ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جائیے۔"

"اگرچہ مجھے خود تو سگریٹ سے بھی کوئی شوق نہیں، لیکن ایک دوست اپنا یہ سگار بھول گیا تھا۔ آپ اسے ملاحظہ فرما سکتے ہیں"۔ سگار کو دیکھ کر نظام دین کا گھوڑا خوش ہو گیا اور میرے ہاتھ سے لے کر اُسے پینے لگا۔ دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے بولا۔ "آپ کے ڈھیلے شاہ کا کیا حال ہے"۔

"اُس کے دماغ میں فتور آچلا ہے۔ میرے بستر میں پڑا ہوا ہے"۔

"اس میں فتور آنے کی کیا بات ہے"۔ گھوڑے نے ذرا آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"خدا کی شان دیکھو گدھا اور بستر میں لیٹے"۔

"کیا آپ گدھے کو اللہ کی مخلوق نہیں سمجھتے"۔

"کیوں نہیں۔ میں تو گدھے کی عظمت اور اہمیت کا بے حد قائل ہوں۔ اس کی شرافت پر میرا ایمان ہے۔ مگر"۔

"مگر کیا؟"

"یہی کہ وہ آخر گدھا ہے"۔

"گھوڑے صاحب! یہ بہت پرانا خیال ہے۔ بنیادی طور پر آپ میں اور گدھے میں کوئی فرق نہیں۔ وہ بھی ایک جانور ہے آپ بھی ایک جانور ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ گدھا زمین پر لوٹ لگاتا ہے، آپ پلنگ پر آرام کرتے ہیں۔ چند دن اگر وہ بھی آپ کی طرح نرم بستر پر لیٹا۔ اس نے بھی کیک، پیسٹری، مکھن، توس کھایا، کوٹ پتلون پہنا تو دیکھ لینا وہ بھی آپ سے زیادہ معقول جانور بن جائے گا، بلکہ عجب نہیں جو اُس میں آپ سے زیادہ شائستگی پیدا ہو جائے"۔

"گھوڑے میاں! کیا تم کبھی فلسفے کے طالب علم رہے ہو؟" میں نے گھوڑے کی باتوں سے متاثر ہو کر بے ساختہ پوچھا۔ گھوڑے نے ہنہنا کر جواب۔

"فلسفہ کسے کہتے ہیں؟ کیا یہ کوئی اچھی قسم کی گھاس ہے؟"

"میرا مطلب ہے تم جو یہ باتیں کر رہے ہو نہیں یہ کس نے بتائیں؟"

"یہ باتیں میری نہیں۔ گاؤں کے نمبردار کے کانے گدھے کی نزاکتِ تخیل کا نتیجہ ہیں اور یہی کانا گدھا آپ کے ڈھیلے شاہ کا لاہنما ہے۔"

مَیں نے سر پیٹ کر او رچلا کر کہا۔ "گدھے، گھوڑے، بکری، بھینس ان سب کے نمائندے تقدیر کے چوپال میں جائیں گے کیا ہم انسانوں کا کوئی نمائندہ وہاں نہ جائے گا۔ کیا ہم قسمت کے مارے انسانوں کو طریقے سے زندگی گزارنے کا کوئی حق نہیں۔ ہم عوام کے نمائندے، انسانوں کے نمائندے۔"

"اے ہے، کیا سوتے میں شور مچا رکھا ہے۔ ہوش میں آؤ۔" بیوی نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا۔ "مبارک ہو۔ اس دفعہ انتخابات نہایت آزادی سے ہوئے ہیں۔ عوام نے اپنی مرضی سے اپنے نمائندے چنے ہیں۔ عوام زندہ باد۔ جمہوریت زندہ باد۔ پاکستان پائندہ باد۔"

میں نے آنکھیں مل کر دیکھا تو واقعی ٹیلیویژن پر الیکشن کے نتائج کا فیصلہ کن اعلان ہو رہا تھا۔ کس قدر مسرت کا مقام تھا کہ عوام نے برادریوں کے بُت توڑ ڈالے۔ چودھراہٹیں ختم کر ڈالیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میں نے بیوی سے کہا۔ "بیگم میں تو نہایت ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا۔ شکر ہے اُس کی تعبیر کتنی سہانی نکلی۔"

بیوی نے جواب دیا۔ "ایسے عمدہ موقع پر آپ کو ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں۔ دراصل آپ کے خواب چمگادڑ کے خواب ہیں۔ جس طرح وہ روشنی سے ڈرتی ہے اسی طرح آپ ایسے رجعت پسند ہر نئی صورتحال اور انقلاب سے خوف کھاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ بات نہیں، بیوی جلدی سے آفتابے میں پانی لاؤ۔ میں وضو کر کے سجدۂ شکر ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

فغانِ درویش

"وہ شرابی تھا"

"عیّاش تھا!"

"غدار تھا!"

"بدکردار تھا!"

"اُس نے قوم کو تباہ۔۔۔۔۔"

"وطن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا!"

"اُس نے اپنے محل کو عیاشی کا اڈہ بنا دیا تھا!"

"لیکن یارو۔۔۔۔۔"

"ہم لیکن ویکن کچھ نہیں جانتے!"

"بات تو سنو!"

"ہم اس وقت کوئی بات سُننے کے لئے تیار نہیں!"

مجمع سے ایک آواز بلند ہوتی ہے: "میں اخبار نویس ہوں، میرا یہ فرض ہے کہ لوگوں کو صحیح حالات سے آگاہ کروں۔ سچی اور حقیقت پر مبنی باتوں کو ہر ایک تک بلا خوف و خطر پہنچاؤں ــــ مجھے اس فرض کی ادائیگی سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں اپنی جان قربان کر دوں گا، لیکن حق بات لکھنے سے باز نہیں آؤں گا!"

دوسری آواز: "میں ایک رہنما ہوں۔ حقائق کو سامنے لانا ایک سچے لیڈر کا اولین فرض ہے۔ جب تک حقیقتیں سامنے نہیں آتیں، رہنما کا فرض ادا نہیں ہوتا۔ رہنما لوگوں کو بے وقوف نہیں بناتا۔ ان کو سیدھے راستے پر لگاتا ہے۔ انہیں مملکت کے ایک ایک راز سے باخبر کرتا ہے۔ رہنما کی اپنی زندگی کوئی زندگی نہیں ہوتی، وہ تو عوام کے لیے جیتا اور عوام کے لئے مرتا ہے۔ میں عوام کا خادم ہوں۔ اگر حق بات کہتے ہوئے میری جان بھی چلی جائے، تو کوئی پرواہ نہیں۔ میں ڈنکے کی چوٹ کہنے کو تیار ہوں کہ وہ عیاش تھا، غدار تھا......"

تیسری آواز: "مجھے بھی سچ تنقید سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بلکہ سچ پوچھیے تو حق و باطل میں امتیاز کرنا میں نے ہی سکھایا ہے۔ میں نے ہی زندہ رہنے کا شعور عام کیا ہے۔ میں نے ہی بتایا ہے کہ اصل میں زندگی کیا ہے۔ میں ایک دانشور ہوں، سوچتا ہوں، سمجھتا ہوں، غور کرتا ہوں۔ میرے ہی غور و فکر کے نتیجے میں حالات کا رُخ متعین ہوتا ہے۔ میں ہی لوگوں کے ذہنوں کو بے خبری کی ظلمت سے نکال کر آگاہی کی روشنی میں لاتا ہوں ـــ آگاہی کو پھیلانا اور عزم و حوصلے کے ساتھ شعور کا نور گھر گھر پہنچانا ایک دانشور کا بنیادی فریضہ ہے۔ میں اس فریضے کو جس طرح بھی ہوگا، پورا کروں گا۔ میں ببانگِ دہل اعلان کرتا ہوں کہ وہ نہ صرف عیاش اور غدار تھا بلکہ انتہا درجے کا ظالم اور سفاک بھی تھا۔"

"اے اخبار نویسو! اے لیڈرو! اے دانشورو! تم سچ کہتے ہو۔"

"ہم ہمیشہ سچ کہتے ہیں اور یہ ہمارا فرض ہے۔"

"تم بڑے بہادر، بیباک دلیر اور صاف گو ہو۔"

"بہادری، بیباکی اور صاف گوئی ہماری بنیادی خصوصیت ہے۔"

"تم بڑے مخلص، ایثار پیشہ اور بے لوث ہو۔"

"اس.... میں.... کیا....... شک ہے۔"

"تم نے یہ اقرار رُک رُک کر کیوں کیا ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمیں اتنا تو پرمٹ اور لائسنس ملنا چاہیے کہ ہم سوچ سمجھ کر کسی بات کا جواب دیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کسی قوم کے اخبار نویسوں، لیڈروں اور دانشوروں کے لئے اخلاص،

ایثار اور عالی ہمتی، یعنی بے لوث ہونا بے حد ضروری ہے۔"

"زندہ باد!"

"ہمیں کوئی نہیں خرید سکتا!"

"پائندہ باد!"

"اسی لئے ہم نے عزم کیا ہے کہ اُس غدار اور عیاش کی ایک ایک بدی لوگوں پر روزِ روشن کی طرح عیاں کردیں —— اور نہ صرف ہم یہ بتائیں کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں کیا کیا عیاشیاں کرتا رہا، بلکہ ہم تحقیق اور تلاش کی نازک راہوں سے گزر کر یہ بھی افشا کریں کہ وہ رات کو نیند میں کیسے کیسے سپنے دیکھا کرتا تھا۔ ہم اُس کے ایک ایک خواب کا حساب لے کر دکھائیں گے۔ ہم محنت کرنے والے، بہادر، بے باک اور صاف گو افرادِ قوم ہیں۔ اب کوئی ہمارے اس عظیم ارادے کی تکمیل میں سدِّراہ نہیں بن سکتا!"

"اے قلم کو فضا میں تلوار کی طرح لہرانے والو! اور اے عقل و خرد کے جھنڈے اکھاڑ اکھاڑ کر پھر گاڑنے والو! تمہاری بہادری اور حق گوئی کے کیا کہنے، یہ تو ساری دُنیا پر آشکار ہے، لیکن ...."

"لیکن کیا؟"

"جس غدار اور عیاش کے بارے میں تم اتنے صفحات سیاہ کرنے اور اتنے لفظوں کے گولے چھوڑنے اور توپیں چھوڑنے کا ارادہ کر رہے ہو، وہ تو ...."

"ہمیں معلوم ہے عیار تھا!"

"مکار تھا!"

"یہ درست ہے مگر میری گذارش بھی تو سُنو!"

"ہمیں غصہ آرہا ہے!"

"ہمارا خون کھول رہا ہے!"

"اُس نے قوم کے ساتھ جو غداری کی ہے، ہم اُس کا بدلہ لے کر رہیں گے!"

"ہم اُسے اُس کے ظلم و ستم کا مزہ چکھائیں گے۔"

"ہم اہلِ قلم اور اہلِ دانش ہیں۔ کسی سے ڈرنے اور دبنے والے نہیں۔"

"لیکن جس غدار اور عیاش کو بے نقاب کرنے کے بارے میں تم اس قدر جوش و خروش دکھا رہے ہو، وہ تو ایک طرح ختم ہو چکا ہے، ماضی بن چکا ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"جب یہ ماضی بحال تھا، اُس وقت تم لوگ کہاں سو گئے تھے۔ تمہارے قلم کہاں گم ہو گئے تھے۔ تمہاری زبانیں کیوں گنگ ہو گئی تھیں۔ کیا تمہارا خاموش رہنا معمولی جرم تھا؟"

"ہم اُس وقت بھی خاموش نہیں رہے۔"

"تم نے کب اور کہاں کوئی بات کھل کر کہی؟"

"ہم نے اشاروں کنایوں میں بہت کچھ کہا۔"

"گویا تم نے اپنا فرض ادا نہیں کیا، بلکہ عورتوں کی طرح ادائیں دکھائیں۔ عشووں اور غمزوں سے کام نکالا۔ اے صحافیو! اے دانشورو! اے قوم کے معشوقانِ طرحدار زندہ باد۔"

"ہم مجبور تھے۔"

"تم مجبور نہیں تھے۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ حق بات کہنے کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے اور تم اس سے گریز کرتے رہے۔"

"بہر حال، اب ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہم اُس غدار سے اچھی طرح نمٹیں گے۔"

"تم نے ہر جانے والے کو چند روز کے لئے گالیاں دیں اور پھر فوراً ہی آنے والے کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح نہ تم کسی جانے والے کا کچھ بگاڑ سکے اور نہ تمہیں کسی آنے والے کو صحیح راستہ دکھانے کی توفیق حاصل ہو سکی۔"

"اب ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں۔"

"ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے اس وقت ماضی سے زیادہ حال پر کڑی اور منصفانہ تنقید کی ضرورت ہے۔ حال کو خوش آمدید کہو اور دل کھول کر کہو، لیکن اس طرح نہیں کہ خوش آمدید، خوشامد بن جائے۔ تم جانتے ہو خوشامدید کہنے اور خوشامد کرنے میں بظاہر معمولی سا فرق نظر آتا ہے، لیکن نتائج کے اعتبار سے یہ فرق بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تمہیں ایک سچے محبِ وطن کی حیثیت سے بے لوث اور بے باک تنقید کرنا ہے۔ اگر ہم صرف مرے ہوئے ماضی کے نقائص ہی دیکھتے رہے اور حال پر انصاف کے ساتھ نظر ڈالنے کی ہمت نہ کر سکے، تو ہمارا مستقبل کبھی روشن نہیں ہو سکتا۔ تم اپنے عزائم کی ساری بجلیاں ماضی کی ورق گردانی کے لئے بار بار چمکاتے رہے، دیکھو! کہیں یہ آنکھ مچولی تمہیں حال کے سنگین حقائق سے بے خبر نہ کر ڈالے۔ ماضی کو بُرا کہہ کر چپ ہو رہنا تمہاری عادت بن چکی ہے۔ دراصل تم ایسا کر کے اپنے آپ کو حال کی ذمہ داریوں سے بچانا چاہتے ہو۔" پہاڑی کی اونچی چوٹی پر کھڑا ہوا ایک بوڑھا آنکھوں سے معذور اسکول ماسٹر یہ تقریر کر رہا تھا کہ پاس بیٹھے ہوئے چرواہے نے اُسے مخاطب کر کے کہا: "ماسٹر جی! تم کس کو یہ باتیں سنا رہے ہو۔ قبیلے کے لوگ تو کبھی کے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں!"
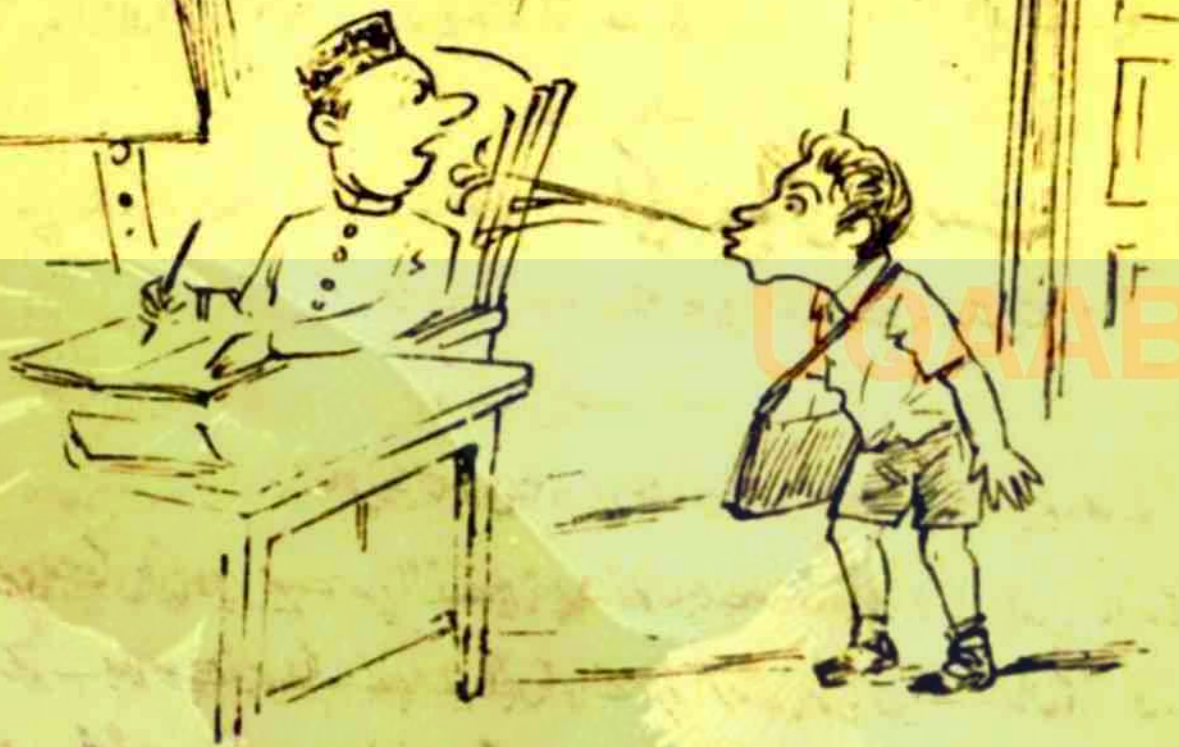
ایک پاگل دوست

(نفاست پسند حضرات سے معذرت کیساتھ)

"چاند پر تھوکتا ہوں۔ سورج پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اور پھر دیکھتا ہوں میرا تھوک، میری لعنت کس طرح واپس میرے منہ پر آگرتے ہیں۔ پرانے لوگ بڑے سادہ لوح ہوتے تھے چاند پر خاک ڈالتے تھے ــــ بھلا سوچئے تو سہی خاک بے چاری واپس اُن کے منہ پر آکر نہ گرتی تو کیا کرتی ــــ خاک کی قسمت ہر حال میں نیچے گرنا ہے۔ یقین جانو میرا تھوک ایسی گولی ہے جو سیدھی چاند کے سینے میں جاکر لگے گی۔ آخ تھو"

جمیل نے تھوکا اور اس کا لعاب دہن سیدھا میرے منہ پر آکر پڑا ــــ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑ کر میرے سینے سے لپٹ گیا اور رو رو کر کہنے لگا "یار! مجھے معاف کر دو۔ تم اِس وقت کہاں سامنے آگئے" وہ میرے سینے سے لگا مسلسل مجھ سے معافی مانگ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا لوگ جمیل کو پاگل کہنے میں کس حد تک حق بجانب ہیں۔

میں آپ کو جمیل کے گھر کا پتہ بتا سکتا تھا تاکہ معلوم ہو جاتا کہ میری بات میں کس حد تک صداقت پائی جاتی ہے۔ لیکن اب میں ایسا نہیں کر سکتا البتہ آپ سے اُس کا تفصیلی تعارف ضرور کرا سکتا ہوں، ممکن ہے اسی سے میرے بیان کی سچائی آپ پر واضح ہو جائے۔

وہ متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ متوسط گھرانے کا مطلب آپ اچھی طرح سمجھتے ہوں گے۔ ایسا گھرانا جہاں موت اور زندگی ایک ساتھ موجود رہتے ہیں۔ گویا جہاں نہ مرنے کا مزہ ہے نہ جینے کا۔ لیکن اس کے باوجود جب میری اور اس کی دوستی کا آغاز ہوا اس کی زندگی میں بڑا اطمینان تھا اور اسی چیز نے ہم سب دوستوں کو حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ متوسط گھرانے میں رہ کر آدمی اوپر بھی دیکھتا ہے اور نیچے بھی لیکن اُسے مفلسی کی آنچ تو

پوری طرح پہنچتی ہے آسودہ حالی کی ٹھنڈی ہوا انہیں لگتی اور اگر کبھی کوئی مرا پٹا جھونکا آتا بھی ہے تو وہ اس آنچ کی نذر ہو جاتا ہے۔ جمیل کو دیکھ کر ہم اسی لئے حیران ہوتے تھے کہ یہ ظالم کس طرح حالات کا مقابلہ کرتا ہے اور کس طرح اُس کی زندگی میں اطمینان کی شاداب فضا موجود ہے۔

"جمیل کا کہنا تھا زندگی میں اطمینان چاہتے ہو تو طبیعت میں نفاست پیدا کرو۔ گھر کو صاف ستھرا رکھنا اپنے ذہن کو صاف ستھرا رکھنے کے مترادف ہے اور ظاہر ہے جب ذہن صاف ستھرا رہے گا تو زندگی میں خواہ مخواہ اطمینان کی فضا پیدا ہو جائے گی"۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم جب بھی جمیل کے گھر جاتے ہمیں ایک خاص طرح کی مسرت حاصل ہوتی۔ ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ موجود۔ گرد و غبار کا نام تک نہیں۔ اس کے ڈرائنگ روم میں ایک معمولی سا صوفہ اور چار پانچ عام سی کرسیاں ہوتیں لیکن یہی عام صوفہ اور کرسیاں کچھ اس صفائی اور سلیقے سے رکھی ہوتیں کہ انہیں دیکھ کر غیر معمولی پن کا احساس ہوتا۔ اس کے گلدانوں میں ہم نے کبھی پھولوں کی بہتات نہ دیکھی لیکن وہ مصنوعی پھول لگانے کا بھی قائل نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کے گلدان سدا سہاگن نظر آتے تھے وہ کہا کرتا تھا پھول تو بڑی چیز ہے گلدان میں سلیقے کے ساتھ گھاس کی ایک ٹہنی بھی لگا دی جائے تو وہ بھی بہار دے جاتی ہے۔ اسی طرح وہ لباس میں بھی سادگی اور پُرکاری کا قائل تھا۔ قیمت بھی کم لیکن دیکھنے میں نہایت باوقار۔ اصل میں یہاں بھی اس کی نفاستِ طبع ہی اپنے جوہر دکھاتی تھی۔ مجال ہے جو کہیں کوئی دھبہ یا شکن نظر آ جائے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ اس کی نفاست کا تعلق صرف اس کی ذات تک محدود نہ تھا۔ اُس کے بیوی بچے بھی ہمیشہ صاف ستھرے رہتے تھے۔ کوئی جب چاہے اس کے گھر آ جاتا یہی معلوم ہوتا جیسے گھر کا گھر مہمان کے انتظار میں بن سنور کر بیٹھا ہے۔

آج جب دو سال بعد میں ولایت سے لاہور آیا تو پہلی بُری خبر مجھے یہی ملی کہ جمیل پاگل ہو گیا ہے۔ میں فوراً اس کے گھر پہنچا اور اب جیسے ہی اس سے میرا سامنا ہوا میرے منہ پر اس کا لعابِ دہن آ کر پڑا۔ میں نے دیکھا گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ ڈرائنگ روم میں صوفے کا بُرا حال ہے دیواروں پر جا بجا تھوک اور پان کی پیک کے عجیب و غریب نشان بنے ہوئے ہیں۔ بستروں پر میلی چادریں بچھی ہوئی ہیں۔ چھتوں اور کونوں میں مکڑی کے جالے لگے ہوئے ہیں۔ دروازے اور کھڑکیاں گرد و غبار سے اٹی پڑی ہیں۔ سب سے بڑھ کر

حیرت اور دُکھ مجھے اس بات پر ہُوا کہ جمیل ہی نہیں اُس کے بیوی بچے بھی نہایت گندے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ غرض جس قدر مثالی طور پر یہ گھرانا صاف ستھرا رہتا تھا اُس سے کہیں زیادہ اب اس کی حالت خراب تھی۔

جمیل کو جب یقین ہو گیا کہ اُس کا تھوک جو اتفاق سے میرے مُنہ پر آ گرا تھا میرے لئے باعث ملال نہیں بنا تو وہ حسبِ معمول خیریت پوچھنے کے بعد مجھ سے اجازت لے کر غسل خانے چلا گیا۔ جمیل کی بیوی نے بتایا کہ آجکل وہ یعنی جمیل سخت پیچش میں مبتلا ہے بلکہ" سچ پوچھیئے تو سارے گھر کو یہ موذی مرض لاحق ہو گیا ہے"۔

میں نے کہا" مگر بھابی! یہ مرض تو غلاظت کی وجہ سے ہُوا کرتا ہے۔ اور آپ لوگ تو ماشاءاللہ نہایت نفاست پسند واقع ہوئے ہیں"۔

جمیل کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ بولی" کچھ نہ پوچھیئے بھیّا! شاید اب ہمارے گھر سے زیادہ گندہ دنیا میں کسی کا گھر نہ ہوگا"۔

"یہ انقلاب کیسے آیا؟"

"آپ کے بھائی جان کی وجہ سے"!

"وہ کیوں کر؟"

"کیا عرض کروں۔ بڑی درد بھری داستان ہے"۔

"آخر پھر بھی"۔

"کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں۔ مثلاً بچوں کو یہ حکم ہے کہ وہ بالکل غسل نہ کریں۔ منہ ہاتھ بھی اُن سے چھپ چھپا کر دھویا جاتا ہے۔ اور تو اور دانتوں میں منجن تک نہیں کرنے دیتے۔ کہتے ہیں مُنہ سے بُو آنا نہایت ضروری ہے۔ بُو نہ آنے تو انسان کا منہ نہیں رہتا جانور کی تھوتھنی بن جاتا ہے۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ عموماً جانوروں کے مُنہ سے بُو نہیں آتی۔ ورنہ انسانوں کے منہ سے بدبو کے وہ بھبکارے آتے ہیں کہ پاس بیٹھنے والے کی طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جی بھر کر گندے ہو جاؤ تاکہ دنیا والوں کو تمہارے انسان ہونے کی خبر ملتی رہے اور انہیں تمہارے قرب سے یک گونہ مسرت بھی حاصل ہو"۔

"جمیل جب دفتر میں ہوں آپ اُس وقت بچوں کو نہلا دھلا دیا کریں"۔ میں نے مشورے کے طور پر کہا۔

"ایک مہینے سے دفتر بھی نہیں گئے۔"

"کیوں؟"

"وہاں بھی عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں۔ اپنی میز اور کرسی کے ارد گرد تمام دفتر کا کوڑا جمع کر لیتے ہیں۔ ماتحتوں کو باقاعدہ لکھ کر یہ حکم دے رکھا ہے کہ جب وہ صبح دفتر آئیں تو آپس میں ایک دوسرے کو حقارت سے دیکھیں اس کے بعد اچھی طرح کھنکار کر ایک دوسرے کے منہ پر تھوک پھینکیں۔ خود جب اپنے افسر کے سامنے جاتے ہیں تو اُسے سلام کرنے کے بجائے حقارت سے دیکھ کر فوراً تھوکتے ہیں۔ ایک ماتحت نے اُن سے کہا:

جمیل صاحب آپ ہمیں تو کہتے ہیں ایک دوسرے پر تھوک پھینکیں اور خود افسر کو دیکھ کر زمین پر تھوک ڈالتے ہیں، غالباً آپ کو ڈر لگتا ہے۔"

انھوں نے جواب دیا "میں کسی خوف کی وجہ سے ایسا نہیں کرتا بلکہ درحقیقت ہمارے افسر اس قابل بھی نہیں ہیں کہ اُن کے منہ پر تھوک ہی دیا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے کیمسٹری پڑھی ہے۔ دفتر میں بیٹھے بٹھائے ایسی بدبودار گیس چھوڑ دیں گے کہ سب کا بُرا حال ہو جاتا ہے۔ جب کلرک وغیرہ احتجاج کرتے ہیں تو کہتے ہیں "تم لوگوں نے دفتر میں جو غلاظت پھیلا رکھی ہے تمہیں اس کا احساس ویسے نہیں ہوتا اب میں نے اس غلاظت کو واضح کیا ہے تو چلا اٹھے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں تمہاری میزوں پر رکھی ہوئی ہر فائل تمہاری غفلت اور خود غرضی کی وجہ سے گندگی کا پلندہ بن چکی ہے۔" کبھی فائلوں میں مرغیوں کی تازہ بیٹھ رکھ دیتے ہیں۔ کبھی مکھیاں مار کر اُن میں ڈال دیتے ہیں۔ جب متعلقہ اہل کار واویلا کرتا ہے تو اُسے کہتے ہیں تم نے اس فائل کو دیر سے اپنے پاس رکھا ہوا تھا اور جو کچھ تم اس فائل سے حاصل کرنا چاہتے تھے میں نے اس کی اصل صورت تمہیں دکھا دی ہے۔ یقین جانو رشوت سے حاصل کی ہوئی دولت ان چیزوں سے بھی زیادہ بدبودار اور گندی ہوتی ہے۔ تمہاری حس مر چکی ہے۔ میں اُسے زندہ کرنا چاہتا ہوں۔" ایک دفعہ ایک رشوت خور افسر نے ویسے ہی جمیل سے کہہ دیا "بھئی جمیل آج میری طبیعت خراب ہے" فوراً بولے "جنابِ والا آپ کو آج پتہ چلا ہے کہ طبیعت خراب ہے۔ مجھے تو بہت دنوں سے معلوم ہے کہ آپ کی صحت کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔ فوراً علاج کرائیے ورنہ بن آئی موت مر جائیے گا۔" افسر نے قدرے پریشان ہو کر کہا:

"جمیل! تم جانتے ہو رات دن کام کرنا پڑتا ہے صحت خراب نہ ہو تو اور کیا ہو۔ کوئی علاج بتاؤ" جمیل بولے:

"قبلہ علاج تیر بہدف ہے کاش آپ اُس پر عمل کر سکیں" افسر نے بڑے اشتیاق سے پوچھا جلدی بتاؤ!

میں اُس پر ضرور عمل کروں گا"

"اگر ایسا ہے تو جناب عالی! اس خاکسار کا نہایت پُرخلوص مشورہ یہ ہے کہ آپ جب صبح کو رفع حاجت

کے لئے بیت الخلا جائیں تو کموڈ کو فلش کرنے سے قبل اُس میں زیادہ نہیں لمحہ بھر کے لئے اپنی ناک

ڈبو لیا کریں"

"کیا بکواس ہے"

"جی ہاں اپنے کموڈ میں اپنی ناک ڈبونا واقعی بکواس ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے ملازموں کے سنڈاس

میں جاکر اس نسخے پر عمل کریں پھر جناب کو یقیناً جلدی شفا ہوگی"

جمیل کی بیوی یہ واقعہ سُنا کر زار و قطار رونے لگی۔ وہ بار بار یہی کہے جا رہی تھی جمیل پاگل ہو گئے

ہیں... اُن کا دماغ ٹھیک نہیں رہا" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا "بھابی! ہمت سے کام لو۔ جمیل

کی حالت ایسی تشویشناک نہیں ہے"۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی "آپ کہتے ہیں تشویشناک نہیں ہے۔

ہماری زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔ بچوں سے کہتے ہیں" سکول جاتے وقت مجھ پر اور اپنی امی پر تھوک کر جایا

کرو" جب میں اس پر اعتراض کرتی ہوں تو کہتے ہیں" بچو! تمہاری ماں حقیقت کا مقابلہ کرنے سے ڈرتی ہے۔ اِس

کے حصے کا تھوک بھی مجھ پر ڈال دیا کرو۔ کم عمر بچے تو ایک دو بار کہنے سے ایسا کر دیتے ہیں۔ بڑی عمر کے بچے جب

ایسا کرنے سے گریز کرتے ہیں تو اُن پر بُری طرح خفا ہوتے ہیں۔ اسی طرح بچوں سے کہہ رکھا ہے کہ سکول

پہنچ کر اُستاد کو سلام کرنے کے بجائے اُس پر زوردار قسم کا تھوک پھینکا کرو۔ ظاہر ہے بڑے بچے تو ایسا نہیں

کرتے لیکن کم عمر بچے ایسا کر جاتے ہیں اور اکثر اُن کی بُری طرح پٹائی ہوتی ہے۔ کل ہی کی بات ہے جب ننھا گُوگو

سکول سے واپس آیا تو اُس کا منہ سوجھا ہوا تھا۔ ناک سے خون جاری تھا۔ پتہ چلا کہ اُستاد نے اُسے تھوک پھینکنے

پر یہ سزا دی۔ ننھے گُوگو نے اُستاد صاحب کو بہت کچھ سمجھایا کہ میرے ابّو کہتے ہیں اپنے اندر کی گندگی باہر نکال دینی

چاہیئے۔ یہ گندگی اپنے والدین اور استادوں پر اس لئے پھینکنے کی ضرورت ہے کہ انہیں اس کا احساس نہیں رہا

ہے کہ وہ کس قدر غلیظ ہو چکے ہیں۔ اور جب ٹوگو نے اُستاد صاحب سے یہ سوال کیا "کیا آپ نے کبھی اپنے اندر کی غلاظت کو دیکھنے کی کوشش کی ہے؟" تو اس پر اُستاد صاحب آپے سے باہر ہو گئے اور ساؤ دیکھا نہ تاؤ بچے کے منہ پر بے تحاشا طمانچے مارنے شروع کر دیئے۔" جمیل کی بیوی نے دو چار لمبے لمبے سانس لئے اور پھر بولی "آپ جانتے ہیں جمیل گھر میں کسی قسم کا جانور پالنے کے قائل نہیں تھے خصوصاً کتا، بلی اور مرغیوں سے تو انہیں خلوص نفرت تھی اب یہی ان کے محبوب ترین جانور ہیں۔ اوّل تو ویسے ہی ان جانوروں کا فضلہ بہت بدبودار اور نفرت انگیز ہوتا ہے مزید یہ کہ جمیل ان جانوروں کو اُلٹی سیدھی چیزیں کھلاتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے یہ اور بھی بدبودار ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کتے کو کچا گوشت ڈال دیتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ قے کرتا ہے اور یقین کیجئے بھیّا اُس کی قے ایک آنکھ نہیں دیکھی جاتی لیکن جمیل اُس قے کو پلیٹ میں اٹھا کر رکھ لیتے ہیں۔ اُس پر چاندی کا ورق لگاتے ہیں اور جب کوئی مہمان خصوصیت کے ساتھ بہت صاف ستھرا مہمان آتا ہے تو اُس پلیٹ کو اُس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ابھی پانچ چھ روز کا ذکر ہے کتّے نے ایسی گھناؤنی اور بدبودار قے کی کہ ہم سب کا کھایا پیا فوراً نکل گیا اور تمام گھر میں سانس لینا محال ہو گیا۔ اسی اثنا میں حکیم بشارت اللہ آگئے۔ آپ جانتے ہیں وہ کس قدر نفیس طبع انسان ہیں۔ میں نے چاہا فوراً اس قے کو صاف کر دوں جمیل ناراض ہو گئے۔ "تم اِسے ہاتھ مت لگانا۔ میں خود اٹھاؤں گا۔" حکیم صاحب کے پاس آ کر کہنے لگے "قبلہ آج آپ بڑے موقع پر تشریف لائے ہیں۔ میں آپ کو ایک تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ تحفہ کیا اسے ہمارے عہد کی رُوح سمجھئے اِسے ہماری تہذیب کا خلاصہ بھی کہا جا سکتا ہے۔" بے چارے حکیم صاحب بڑے شوق کا اظہار کرتے ہوئے بولے "بھئی واللہ وہ کیا چیز ہے؟ ہمیں ضرور عنایت فرمایئے۔" "ابھی حاضر کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر جمیل نے اس قے کو حسبِ معمول پلیٹ میں رکھا اس پر چاندی کے ورق لگائے۔ اُسے باقاعدہ ڈھانپا اور ڈرائنگ روم میں لے جا کر حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اندر میں لاکھ سر پٹختی رہ گئی لیکن اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ حکیم صاحب نے جیسے ہی پلیٹ سے ڈھکنا اُٹھایا۔ شدید بُو سے اُن کا دماغ پھٹنے کو ہو گیا۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چاندی کے ورق بھی لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے پلیٹ کو ایک نظر ڈال کر فوراً ہی سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ جمیل بولے "قبلہ گھبرا کیوں گئے؟ چمچے کے ساتھ ورق ہٹا کر نیچے دیکھئے۔

پھر آپ کو اصل حقیقت معلوم ہو گی۔" حکیم صاحب نے جمیل کے کہنے کے مطابق اپنی طبیعت پر جبر کرکے ایسا بھی کیا اور پھر منہ کو سوالیہ نشان بنا کر کہنے لگے "لیکن جمیل خدا کے لئے کچھ بتاؤ بھی تو کہ اس قدر تعفن اور کراہت سے بھری ہوئی یہ چیز کیا ہے؟" فوراً بولے "بظاہر تو یہ کتے کے معدے کی الائش ہے جسے وہ ہضم نہیں کر سکا میں نے اس میں مرغی کی کچھ تازہ بیٹھ بھی شامل کر لی ہے۔ لیکن دراصل جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے یہ ہمارے عہد کی حقیقت اور ہماری تہذیب کا سرمایہ ہے۔" حکیم صاحب پکار اٹھے "واللہ میں نہیں سمجھ سکا۔"

جمیل نے کہا "قبلہ! آپ کی سمجھ میں سب کچھ آ رہا ہے آپ محض تکلف فرما رہے ہیں ۔۔۔ کتے کی قے یعنی دولت کی ہوس ہمارے عہد کی سب سے بڑی قدر ہے، مرغی کی بیٹھ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ہماری فکر کی اڑان مرغی کی پرواز سے آگے نہیں جس کے نتیجے میں بدبودار بیٹھ سے زیادہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور چاندی کا ورق ہماری تہذیب کی وہ چمک دمک اور پردہ ہے جس کی آڑ میں ہم اپنی یہ تمام غلاظتیں چھپائے پھرتے ہیں۔" حکیم صاحب نے لاحول پڑھی اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے "جمیل تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

جمیل کی بیوی مجھے یہ باتیں سنا ہی رہی تھی کہ جمیل بھی غسل خانے سے آگیا۔ اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگا "مشکور بھائی! طاہرہ کی باتوں میں بالکل نہ آنا آج کل اسے میری شکایتیں کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔" میں نے تمام احتیاط اور رکھ رکھاؤ کو نظر انداز کرتے ہوئے جمیل سے براہ راست سوال کر ڈالا "دوست! تم نے اپنا اور اپنے گھر کا یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟"

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھ سے کسی تکلف کے بغیر گفتگو کا آغاز کیا۔"

"دوستوں میں تکلف کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ چنانچہ اسی بے تکلفی سے میرا جواب بھی سن لو ۔۔۔ میری طبیعت میں کس قدر نفاست تھی تمہیں خوب معلوم ہے۔"

"اسی لئے تو اس انقلاب پر حیرت اور تشویش ہوتی ہے۔"

"میں تمہاری حیرت اور تشویش ابھی دور کئے دیتا ہوں۔" جس ذہنی توازن کے ساتھ جمیل نے مجھ سے باتیں کرنا شروع کیں مجھے اس پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے کہا "میری ہم جماعت دُرِ دانہ تمہیں

یاد ہے نا؟"

"بہت اچھی طرح سے۔ بلکہ آپ اس پر۔"

"بلکی بات چھوڑو۔ میں اُسے ایک اچھی لڑکی سمجھتا تھا اور بس۔"

"بھابی سے ڈر کر تو ایسا نہیں کہہ رہے ہو؟"

"ظاہر وہ اس حقیقت سے خوب واقف ہے۔"

"معاف کیجئے ازراہ مذاق یہ بات کہی تھی۔" میں نے اپنی حماقت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔ جمیل نے بات کو آگے بڑھایا۔

"ہاں تو میں دُروانہ کو بہت ہی نفیس طبع لڑکی سمجھتا اور اس میں کوئی کلام بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اُس کا ذوقِ جمال کس قدر نکھرا ہوا تھا۔"

"یار ذوقِ جمال تو ہر لڑکی کا نکھرا ہوتا ہے یا یوں سمجھ لو ایسا دکھائی دیتا ہے۔" میں نے پھر لقمہ دیا۔ جمیل بولا۔

"دکھائی دینے والی بات زیادہ درست ہے۔ بہرحال دُروانہ کی نفاستِ طبع کا میں ہی نہیں بلکہ تمام کالج قائل تھا۔ پھر اس کا معاشقہ احمر سے چل پڑا۔ بعد ازاں اسی سے اُس کی شادی ہوگئی۔ وہ ہمارے ہی محلے میں آ کر رہنے لگا۔ احمر نہایت "کامیاب" انجنیئر ثابت ہوا۔ چند دنوں میں خوب روپیہ کما کر ایک عالیشان مکان تعمیر کرا لیا۔ بہت بڑی گاڑی خرید لی۔ لوگ احمر اور دروانہ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے واقفیت اور قریب ہونے کی وجہ سے میرا اُن کے ہاں خوب آنا جانا تھا۔ مجھے یہ معلوم کر کے بہت دُکھ ہوا کہ دُروانہ احمر کو بے وقوف بنا رہی ہے۔ وہ اُس کے سامنے بے حد محبت کا اظہار کرتی اور اپنے مرد دوستوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہتی۔ احمر مصروف آدمی تھا۔ غالباً اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ پھر بھی مجھے احمر کی بے خبری پر بہت غصہ آتا۔ میں اُسے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ادھر دُروانہ بھی مجھے اپنے "دوستوں" میں شامل کرنا چاہتی تھی۔ اُس کے تبسم کی کشش سے کیسے انکار ہو سکتا تھا۔ میں بھی بہک گیا ہوتا اگر میری کم ہمتی میرے آڑے نہ آ گئی ہوتی۔ مجھے دُروانہ کی دکھاوے کی نفاست سے گھبراہٹ ہونے لگی،

بعدازاں اُس کے دوستوں کو دیکھ کر تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کے ہاں ایک سے ایک صاحبِ ذوق آتا اور پھر مجھے اُس کے "ذوقِ سلیم" اور "نفاستِ طبع" کی اصل حقیقت معلوم ہوتی۔ رسالہ جمال کے ایڈیٹر کو کون نہیں جانتا؟"

"وہی اپنے فروزاں صاحب۔ بھئی واقعی بہت عمدہ آدمی ہیں۔ نہایت شریف، نہایت نفیس۔"

"جی ہاں انہی فروزاں صاحب کا ذکر کر رہا ہوں۔ اُن کا دُردانہ کے ہاں آنا جانا ہوا۔ چند روز بعد ہی وہ مطالبہ کرنے لگے "دُردانہ! میں اپنا کاروبار چھوڑ کر اور اڑھائی روپے ٹیکسی کے خرچ کر کے تمہارے پاس آتا ہوں اور یہاں ایک جھگڑا لگا رہتا ہے۔" جب وہ یہ الفاظ کہہ رہے تھے میرے سوا دُردانہ کے پاس کوئی موجود نہ تھا۔ مجھے فروزاں صاحب کے کاروباری اور گھٹیا آدمی ہونے کا پہلی بار احساس ہوا۔ اُسی زمانے میں کسی نے مجھے بتایا کہ فروزاں صاحب اصل میں محرر چونگی ہوتے تھے ان کی وہ ذہنیت ابھی تک نہیں بدل سکی۔ بعدازاں وہ احمر کے مُنہ بولے بھائی بن گئے اور پھر بھائی نے بھائی کے گھر کو خوب فحاشی کا اڈہ بنایا۔ اپنا رسالہ چلانے کے لئے بھی وہ بہت ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ ان تمام حقائق کے باوجود فروزاں صاحب کو لوگ نہایت شریف اور نفیس طبع انسان سمجھتے ہیں اب میں اپنی آنکھوں کو کہاں لے جاؤں کہ مجھے تمہارا یہ نفیس طبع دوست ایک بہت بڑا غنڈہ دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح دُردانہ کے ہاں اپنے شہر کے ایک عظیم ادارے کے مینیجر تشریف لاتے وہ بھی نہایت عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ بہت خوبصورت لباس زیب تن فرماتے، ہمیشہ مسکراتے رہتے البتہ اُن کی پیشانی پر اُس وقت بل پڑتے تھے جب کوئی انہیں ایفائے عہد کے لئے کہتا تھا۔ مگر اس معاملے میں وہ اپنے افسروں کے ساتھ نہایت دیانتداری کے ساتھ پیش آتے۔ اُن کے لئے پینے پلانے کو روزانہ کچھ نہ کچھ بھیج دیتے، اُن کے ذوقِ جمال کی تسکین کا خیال بھی باقاعدگی سے رکھتے۔ عوام کا تو ذکر ہی کیا۔ اعلےٰ سوسائٹی میں وہ آج بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اُن کی نفاستِ طبع کی تو دھوم ہے۔ لیکن جب میں اُن کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھتا ہوں تو مجھے اُن کا چہرہ نہایت مکروہ نظر آتا ہے۔ مینیجر کے بعد دُردانہ کی دوستی ایک نواب زادے سے ہوئی۔ وہ بھی بہت صاف ستھرا اور بنا ٹھنا رہتا تھا۔ ایک دن اُس کا ملازم اُس سے کچھ روپے مانگ رہا تھا۔ اُسے اپنی قریب المرگ ماں کے لئے دوا لانا تھی۔ نواب زادے صاحب فرما

رہے تھے "میرے پاس اس طرح فضول مد میں لٹانے کے لئے کوئی پیسہ نہیں ہے" جب ملازم مایوس ہو کر چلا گیا تو ہم سے اس طرح مخاطب ہوئے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی وہ اپنی عمدہ عادتوں کا ذکر کر رہے تھے فرمایا "صاحب! میں کوئی فضول خرچی نہیں کرتا بس میری ایک عادت ہے کہ تازہ دم رہنے کے لئے دن میں یو۔ڈی کلون کی دو شیشیاں اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مل کر ضرور ختم کر دیتا ہوں —— ان دو شیشیوں کی کم از کم قیمت اُس وقت چھبیس پچیس روپے تھی۔ جمیل اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "مجھے اُس دن سے خوشبو سے بھی نفرت ہو گئی۔ جب میرے پاس سے کوئی خوشبو لگائے گزرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے گوڑے اور غلاظت سے بھرا ہوا کارپوریشن کا ٹرک گزر گیا۔ میں یہی سوچتا رہ جاتا ہوں نہ جانے لوگوں کی کتنی اہم ضرورتوں کو پسِ پشت ڈال کر اس شخص نے یہ خوشبو لگائی ہوگی۔ اور اس خوشبو کے لئے اس نے کس کس کا دل توڑا ہوگا —— یہ کہہ کر جمیل یکایک خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ مجھ سے پھر مخاطب ہوا۔

"لوگ کہتے ہیں میری قوتِ شامّہ زائل ہو گئی ہے اور میری بینائی میں بھی فرق آ گیا ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو وہ سمجھتے ہیں میں پاگل ہو گیا ہوں۔ کیا تم بھی مجھے ایسا ہی خیال کرتے ہو؟"

"ہرگز نہیں۔"

"خدا تمہارا بھلا کرے۔"

"مگر یار" میں نے ذرا رک کر کہا

"مگر کیا؟" اس نے پریشاں ہو کر پوچھا

"میرا مطلب ہے ......" میں پھر بھی کھل کر بات نہ کر سکا

"رک کیوں گئے۔ بولتے کیوں نہیں" جمیل نے ذرا غصہ سے کہا

"میرا مطلب ہے تم نے اپنا اور اپنے گھر کا یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟"

"اس کا مطلب ہوا" جمیل نے حیران ہو کر کہا "اب تک تم نے میری بات نہیں سمجھی"

"کیوں؟"

"خوب!" اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اُلٹا مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ - میرا خیال تھا تم میری بات

کو آسانی سے سمجھ لوگے۔ لیکن اب پتہ چلا تمہارے ساتھ بھی مجھے وہی رویہ اختیار کرنا چاہئے جو میں عام لوگوں کے ساتھ کرتا ہوں" یہ کہہ کر جمیل نے لمحہ بھر کو تامل کیا اور پھر ایک قہقہہ لگا کر زور سے میرے منہ پر تھوک دیا کہنے لگا "کیوں پیارے! اب میری بات سمجھ میں آئی"

"جی ہاں" میں نے اپنے چہرے سے اُس کا لعابِ دہن پونچھتے ہوئے جواب دیا

"تم میرے جگری دوست ہو اس لئے میں نے پھر بھی تمہارا لحاظ کیا ہے اور صرف تھوکنے کو کافی سمجھا ورنہ میں اور بھی بہت کچھ کر سکتا تھا"

"میری جان! تمہیں اجازت ہے تم جس طرح کا سلوک کرنا چاہتے ہو کرو" میرے اس جواب پر جمیل پھر مجھ سے لپٹ کر رونے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا "مشکور! میں کیا کروں کدھر جاؤں۔ تم خود بتاؤ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ صفائی اور نفاست اس زمانے میں بے غیرتی اور سنگدلی کی سب سے بڑی علامت بن چکی ہے جو شخص جتنا زیادہ بدمعاش، جتنا زیادہ چور، جتنا زیادہ ظالم، بداخلاق، بدکردار، دغا باز اور بے ایمان ہوتا ہے وہ اُسی قدر صاف ستھرے مکان میں رہتا ہے صاف ستھرا لباس پہنتا ہے۔ صاف ستھری چیزیں استعمال کرتا ہے نفاست آج کے عہد میں بہت مہنگی چیز ہے۔ انسان کو اپنا اصول، اپنی قدریں، اپنا دین، اپنا ایمان، سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر اُسے صاف ستھرے ماحول میں رہنا نصیب ہوتا ہے۔ ایک دفعہ مجھے اونچے لوگوں کی ایک صاف ستھری بستی میں جانے کا اتفاق ہُوا۔ وہاں کئی اونچے قسم کے مکان بھی دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ دُنیا کی کون سی عمدہ اور نفیس چیز تھی جو ان مکانات میں موجود نہیں تھی۔ لیکن جس مکان میں بھی جانا ہُوا وہاں یہی پتہ چلا کہ اس مکان کا مالک گھر پر موجود نہیں ہے کوئی اپنی دکان پر ہے کوئی اپنے کارخانے میں، کوئی فیکٹری میں اور کوئی کاروبار کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہُوا ہے۔ البتہ بچوں کی شکلیں اُس مکان کے ملازموں سے اکثر ملتی تھیں۔ اُس روز جب میں واپس گھر آیا تو مجھے اپنا صاف ستھرا مکان یوں لگا جیسے کسی طوائف کا چوبارہ ہے۔ اپنے مکان کے ساتھ جو کچھ سلوک میں کر سکتا تھا وہ تمہارے سامنے ہے۔ اُس دن کے بعد سے میں جب بھی کسی کے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھتا ہوں یا کسی کا نفیس مکان مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے یہی محسوس کرتا ہوں جیسے کسی ڈیرے دار طوائف کے مکان میں آگیا ہوں۔ اور مجھے نام نہاد اونچے لوگوں"

کے عالی شان مکانوں کی صاف ستھری بستیاں تو بالکل یوں معلوم ہوتی ہیں جیسے ہمارے ملک میں چکلے ہی چکلے کھل گئے ہیں۔" میں نے دیکھا کہ جمیل کے چہرے پر جو ایک خاص قسم کی وحشت آچلی تھی وہ ختم ہوتی جارہی ہے اور اُس کی جگہ متانت اور سنجیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ مسلسل بول رہا تھا "یقین کرو میرے دوست! ابھی جب پالش کیا ہوا چمکدار جوتا پاؤں میں ڈالتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے پاؤں نہیں کسی خطرناک جاسوس یا قاتل کے پاؤں ہیں، عمدہ سوٹ پہنتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرا سراپا کیا ہے کسی ظالم اور سفاک آدمی کا سراپا ہے۔ ایک دفعہ یونہی دھوپ کا سستا چشمہ لگالیا، آئینے میں دیکھا تو خدا بچائے اپنی صورت ڈاکوؤں سے بدتر نظر آئی۔ سفید کالر اور خوبصورت ٹائی سے مجھے اس قدر نفرت ہو گئی ہے کہ اگر یہ لگاؤں تو خود کو نہ جانے کیا کیا دکھائی دینے لگتا ہے۔ غدار، مکار، دھوکہ باز، زناکار، رشوت خور، حرامی غرض وہ کونسی بُرائی ہے جو مجھ سے وابستہ نہیں ہو جاتی۔" جمیل پانی پینے کے لئے خاموش ہوا تو میں نے اُس سے کہا:

"دوست! مجھے تمہارے خیالات سے پورا پورا اتفاق ہے۔ مگر۔۔۔۔"

"پھر وہی مگر" جمیل بات توڑ کر بولا

"میری بات تو سنو!"

"میں مگر کے ساتھ کچھ نہیں سننا چاہتا"

"میرا مطلب ہے تمہارے خیالات بالکل ٹھیک ہیں۔ آخر زندگی بھی تو گزارنی ہے۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو آدمی کے خیالات میں اور اُس کی عملی زندگی میں مطابقت ضروری نہیں"

"مطابقت ضرور ہونی چاہئے لیکن خیال اور عمل میں جلدی سے ہم آہنگی پیدا نہیں ہوا کرتی" میں نے بزعم خود بڑی زوردار بات کہی۔ جمیل نے فوراً جواب دیا:

"گویا تم صبر و تحمل کی تعلیم دینا چاہتے ہو۔ میں اس صبر کو مصلحت اور فرار سے تعبیر کرتا ہوں" میں نے جب دیکھا کہ جمیل اس وقت بالکل نارمل حالت میں ہے اور نہایت ہوشمندی کے ساتھ گفتگو کر رہا ہے تو اُس سے کہا "یار ہم تمہاری عقل و دانش کے قائل ہو گئے ہیں اب اٹھو اور ہاتھ منہ دھو ڈالو" میرا یہ کہنا تھا کہ جمیل ایکدم آگ بگولہ ہو گیا۔ اُس نے مجھ پر مسلسل کئی بار تھوک پھینکتے ہوئے کہا "میں تم پر اور تمہارے مشورے پر لعنت

بھیجتا ہوں۔ تمہاری یہ خواہش ہے میں پھر صاف ستھرا بن کر تم ایسے شائستہ اور مہذب درندوں میں شامل ہو جاؤں۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔" اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولا "طاہرہ! جلدی سے کڑوے تیل میں توے کی سیاہی ملا کر لاؤ مگر ٹھہرو! اگر گھر میں کولتار ہے تو وہ سب سے اچھا رہے گا لاؤ اور اُسے میرے مُنہ پر مَل دو۔ میرا مُنہ اس طرح کالا کر دو کہ اسے دوبارہ کوئی صاف نہ کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے میرا چہرہ ابھی ایسا ہے جسے صاف کیا جا سکتا ہے۔" میں ابھی جمیل کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ کر کہا "بھاگتے ہو یا تمہارے نکلنے کا کوئی اور بندوبست کیا جائے۔" میں جمیل کے گھر کی چار دیواری سے باہر چلا آیا اور سوچنے لگا واقعی جمیل پاگل ہو گیا ہے۔ پاگل نہ ہو گیا ہوتا تو وہ اپنے خیالات کو عمل میں لانے کے لئے ضد نہ کرتا۔ آجکل جو شخص اپنے خیالات کو عملی زندگی میں لانے پر اصرار کرتا ہے وہی دیوانہ کہلاتا ہے۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ٹھوس خیالات سے ہمیشہ گریز کیا جائے۔ اسی کو مصلحت اندیشی بھی کہتے ہیں۔ میں انہی خیالات میں غرق تھا کہ مجھے جمیل کے گھر سے اس کے چیخنے کی آواز آئی۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا "طاہرہ! میرا مُنہ کالا کر دو۔ کھڑی کیا دیکھتی ہو۔ یہ آنسو بہانے کا وقت نہیں۔ زندگی کی صداقتوں کو سینے سے لگانے کا وقت ہے۔ میرا مُنہ اچھی طرح کالا کر دو۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے گا۔"

طویلے کی بلا

دوستوں کا کہنا ہے کہ میرا محبوب ترین جانور گدھا ہے اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار تو اس ضمن میں یہاں تک کہتے ہیں کہ بجائے محبوب کے ساتھ جانور کے لفظ کا اضافہ بھی تمہارے جذبۂ عشق کی توہین کرنے کے مترادف ہے۔ گویا بقول ڈاکٹر موصوف گدھا میرا محبوب جانور نہیں بلکہ خالصتہً محبوب ہے۔ گدھے سے میں نے کب رومانس لڑایا؟ اس معاشقے کی داستان کا آغاز کیوں کر ہوا؟ یقین جانیے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ویسے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ گدھے سے نفرت کبھی نہیں ہوئی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ گدھے کا بچہ مجھے واقعی بہت پیارا لگتا ہے۔ جہاں تک گدھے کے بچے کے پیارے اور حسین ہونے کا تعلق ہے میں نے بچپن میں بڑے بوڑھوں کو اکثر یہ کہتے سُنا کہ جس شخص کو گدھے کے بچے پر پیار نہیں آتا وہ انسان کہلانے کا حقدار نہیں، ممکن ہے صاحبِ دل اور صاحبِ نظر ہونے کی اوّلین پہچان گدھے کا بچہ قرار نہ پائے مگر میں نے بڑے بڑے اہلِ نظر کے دلوں کو ٹٹول کر دیکھا ہے، انہیں گدھے کے بچے کی محبت میں گرفتار ہی پایا۔ بچپن میں بھی گدھے کے بچے کو دیکھ کر میرا دل بے اختیار ہو جاتا تھا اور اب بھی اگر کہیں اسے دیکھ پاتا ہوں تو جی چاہتا ہے جلدی سے گود میں اٹھا کر پیار کر لوں خواہ وہ اس پیار کے بدلے میں اپنی ننھی منی دولتیاں ہی جھاڑ دے۔ ہنسی کی بات ایک طرف رہی، انصاف سے کہئے کیا آپ کو گدھے کا بچہ پیارا نہیں لگتا؟ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے جانوروں میں صرف گدھا ایک ایسا جانور ہے جس کو حسن و جمال اور عقل و دانش عطا کرنے میں قدرت بڑی عجلت سے کام لیتی ہے۔ پھرتی، چالاکی، بھولپن اور زیبائی گدھے کے بچے میں کیا کچھ نہیں ہوتا؟ اور جیسے ہی گدھے کا بچہ اپنے بچپن کے عہد سے گزر کر مکمل گدھا بننے کے دور میں داخل

ہوتا ہے اُس کی یہ تمام چیزیں یک لخت غائب ہو جاتی ہیں۔ مجھے تو بوڑھے گدھے اور جوان گدھے میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں ہی کچھ فلسفی قسم کی مخلوق دکھائی دیتے ہیں۔ میرا ایک شعر ہے ؎

لوگ اسے بے وقوف کہتے ہیں

جانے کس سوچ میں کھڑا ہے گدھا؟

گدھے کے اسی فلسفیانہ رویئے کی بنا پر میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ اُس کے احترام پر مجبور پایا۔

ایک شام میں اپنے ایک عالم و فاضل دوست کے ساتھ سیر کر رہا تھا۔ چلتے چلتے ہم شہر سے باہر نکل آئے۔ سامنے سے چند گدھے آ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر حسبِ عادت فوراً سر جھکا کر اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوست نے کہا "یہ کیا مذاق ہے؟"

"کون سا؟"

"مئودب ہو کر کیوں کھڑے ہو گئے؟"

"آپ دیکھ نہیں رہے ہیں؟"

"کیا؟"

"گدھے آ رہے ہیں میں اُن کے احترام میں کھڑا ہو گیا ہوں۔"

فاضل دوست نے میرے اس جواب پر کچھ ناراضی کے سے انداز میں کہا "اگر تم مذاق میں ایسا کر رہے ہو تو یہ کوئی معیاری مذاق نہیں اور اگر خدانخواستہ سنجیدہ ہو تو تمہاری عقل پر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔"

"میں سو فی صد سنجیدہ ہوں آپ شوق سے اپنا سر پیٹ سکتے ہیں۔"

اس دفعہ وہ ذرا مسکرا کر بولا "یار! تمہارا معاملہ بھی عجیب ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں سے تمہاری ظرافت شروع ہوتی ہے اور کہاں سے تم سنجیدہ ہو جاتے ہو۔ بہرحال تمہیں ایک بہت بڑے عالم کا مقولہ سناتا ہوں شاید تم پر کچھ انکشافِ حقیقت ہو جائے۔" میں نے کہا "فرمائیے!"

وہ بولے:

"اُس یکتائے زمانہ نے کہا کہ ہر آدمی کی ذات میں ایک گدھا موجود ہے جسے باہر نکالنے کے لئے وہ بڑی کوشش کرتا ہے لیکن گدھا ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا"۔

اُس کا مطلب یہ ہوا کہ گدھا کوئی بُری چیز ہے"

"اور نہیں تو کیا اچھی چیز ہے"

"میں پوچھ سکتا ہوں آپ کو گدھے میں کیا بُرائی نظر آتی ہے"؟

"اور میں پوچھ سکتا ہوں آپ کو گدھے میں کیا اچھائی نظر آتی ہے"؟

ہم دونوں دوستوں نے جواب دینے کے بجائے ایک دوسرے پر سوال کر ڈالے۔ غالباً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت نہ میرے عالم و فاضل دوست کو گدھے میں کوئی نمایاں بُرائی نظر آرہی تھی اور نہ ہی میں پوری طرح گدھے کی اچھائیوں کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ سیر کے بعد ہم ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو مجھے تنہائی میں اس مسئلے پر اچھی طرح سوچنے کا موقعہ ملا۔ لیکن بہت کچھ غور کرنے کے بعد بھی گدھے میں ایسی کوئی بُرائی نظر نہ آسکی جس کی بنا پر میں اُس سے نفرت کرنے لگتا۔ پھر بھی اس مقولے کا مجھ پر اتنا اثر ضرور ہوا کہ میرے دل میں یہ خواہش بڑی شدت کے ساتھ چٹکیاں لینے لگی کہ میں دوسرے لوگوں کی ذات میں چھپے ہوئے گدھوں کا جی بھر کر نظارہ کر سکوں۔ آپ جانتے ہیں لوگوں کے قریب ہونا کون سا آسان کام ہے۔ آپ شیر، چیتے یا کسی دوسرے خوفناک درندے کے قریب ہو سکتے ہیں لیکن ابن آدم کے قریب ہونا ہر کسی کے بس کی بات نہیں پھر بھی میں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ کام کیا۔ مگر مجھے اس میں کامیابی نصیب ہونے کے بجائے سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ میں اپنے معاشرے کے جس فرد کے قریب جاتا مجھے اُس کی ذات میں پوشیدہ کوئی گدھا نظر نہ آتا۔ کیا خلوت، کیا جلوت، کیا کوچہ، کیا بازار، میں نے جہان بھر کی خاک چھان ماری لیکن مجھے کسی کی ذات میں پورا گدھا تو بڑی بات ہے گدھے کا نشان تک نہ مل سکا۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ میں جب بھی اچھی طرح لوگوں کی ذات میں جھانکنے کی کوشش کرتا میری آنکھیں اس خیال سے بند ہونے لگتیں کہ کہیں گدھے کے بجائے گدھے کا بچہ نظر نہ آجائے اور میں گرفتارِ عشق نہ ہو جاؤں۔ ایسا ہو گیا تو پھر لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس ضمن میں مجھے جس دوسرے کڑے تجربے سے گزرنا پڑا وہ یہ تھا کہ کسی کی ذات میں پوشیدہ کوئی گدھا کیا نظر آتا میں تو

اس کوشش میں دوسروں کی طرف ذرا آنکھ بھی اُٹھاتا تھا تو میری اپنی ذات میں افراتفری مچ جاتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔

مجھے اپنا وہ عالم و فاضل دوست ملا تو میں نے اس سے شکایت کے طور پر کہا "بھائی میاں! تم نے کسی بڑے حکیمِ زمانہ کا جو مقولہ سنایا تھا کہ ہر آدمی کی ذات میں ایک گدھا پوشیدہ ہوتا ہے تو کان کھول کر سن لو یہ بالکل غلط ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ میں نے اپنے ارد گرد بلکہ دور دور تک کے لوگوں کی ذات میں اچھی طرح جھانک کر دیکھا ہے مجھے کسی کی ذات میں کوئی گدھا چھپا ہوا نظر نہیں آیا۔ کچھ نظر آنا ایک طرف رہا مجھے تو سخت تکلیف اُٹھانی پڑی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ میں جب بھی دوسروں کی ذات میں چھپے ہوئے گدھے کو دیکھنے کی کوشش کرتا میری اپنی ذات میں کھلبلی مچ جاتی۔ اور اس گڑبڑ سے مجھے بے حد کوفت ہوتی۔"

"تم نے اپنے اندر جھانک کر نہیں دیکھا؟"

"نہیں"

"یار! یہ کیا غضب کیا؟ دوسروں کی ذات میں چھپے ہوئے گدھے کو دیکھنے سے پہلے اپنی ذات میں جھانکنا نہایت ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو قلب ماہیت ہو کر آدمی خود گدھا بن جاتا ہے۔"

"فکر کی کون سی بات ہے۔ یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں" میں نے بڑے زعم سے کہا۔

دوست چلا گیا تو ایک طرف ہو کر کسی توقف کے بغیر میں نے اپنی ذات کے تمام دروازے کھول ڈالے۔ اُف ۔۔۔۔ میری حیرانی اور پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی گدھے ہی گدھے نظر آتے تھے۔ میں حیران اس بات پر تھا کہ اتنے سارے گدھوں کے درمیان میں نے اب تک زندگی گزاری تو کیسے" اور میری پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ لوگ اپنی ذات سے ایک گدھے کو نکالنے میں کامیاب نہیں ہوتے میں اس لاتعداد مخلوق کو

کس طرح جلاوطن کر سکوں گا۔ میری ذات کیا ہے گدھوں کی ایک وسیع و عریض سرزمین ہے۔ میں نے ذرا کان لگا کر سنا تو پتہ چلا یہ گدھے بالکل انسانوں کی طرح آپس میں بات چیت کر رہے ہیں۔ اور کرتے بھی کیوں نہ ؟" آخر ایک آدم زاد کے قالب میں چھپے ہوئے گدھے تھے، عام گدھے تو نہیں تھے —— میں نے سوچا کیوں نہ آج ان سے کچھ ملاقات ہو جائے۔

اس خیال کے آتے ہی میں آگے بڑھا ابھی دو چار قدم ہی گیا تھا کہ سامنے سے ایک نوجوان گدھا خوشی سے ناچتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ قریب پہنچا تو میں نے اُسے روک کر پوچھا "کیا بات ہے آج بہت خوش نظر آرہے ہو ؟"

"میں امتحان میں اوّل آیا ہوں"

"مبارک ہو اب کیا ارادے ہیں"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھوں گا"

"آپ اتنے لائق طالب علم ہیں۔ کیا آپ کے لئے یہ بہتر نہیں ہے کہ معلّم بن کر آئندہ نسل کے ذہنوں کی تربیت کریں"

"آ ہا ہا" گدھے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "آپ مجھے اس قدر بے وقوف سمجھتے ہیں۔ جناب عالی اعلیٰ ہونا چاہیئے میرے ایک چچا پروفیسر ہیں اگرچہ وہ اپنے شاگرد لڑکے لڑکیوں پر کسی نہ کسی طرح رُعب گانٹھ کر اپنا کچھ نہ کچھ کام نکالتے رہتے ہیں لیکن میں نے اُن کو ہمیشہ منہ بسورتے ہی دیکھا۔ یہی کہتے سُنا معلّمی سب سے گھٹیا اور بے کار پیشہ ہے۔ کاش پروفیسر کے بجائے میں کوئی چھوٹا موٹا افسر ہوتا۔ کاش مجھے چالان کرنے ہی کا اختیار دے دیا جاتا" یہ سن کر میں نے کہا :

"آپ معلّمی کے پیشے کی توہین کر رہے ہیں۔ پروفیسروں کو اقتدار کی ہوس نہیں ہوتی۔ وہ اس قسم کی باتوں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ انہیں پڑھنے پڑھانے کے علاوہ اور کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا۔ ایک اُستاد کی بنیادی خصوصیت بے لوث ہونا ہے اور جو شخص بے لوث ہوتا ہے وہ دلیر اور بہادر بھی ہوتا ہے۔ اسی لئے قومی کردار کی تعمیر میں معلّم کی شخصیت بہت بڑا کام کرتی ہے۔ وہ کوئی ایسی بات تسلیم نہیں کرتا جس کو وہ غلط سمجھتا ہے۔ حق و صداقت کو فروغ دینا اُس کا اہم ترین فریضہ ہے۔ اور وہ اپنے اس فریضے کو ہر حال میں

ادا کرتا ہے۔"

گدھا بولا۔ "آپ یہ انسان پروفیسروں کی صفات بیان کر رہے ہیں۔ غالباً آپ بھول گئے ہیں میں گدھا ہوں اور میرے چچا ایک گدھے پروفیسر ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں" گدھے نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "گدھے اُستادوں کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ معمولی سی سفارش پر نالائق طلبا کے پرچوں میں نمبر بڑھا کر لائق طلبا کا حق مار دیتے ہیں اور اُن کی رگِ احساس میں ذرا سا کانٹا تک نہیں چبھتا۔"

"یہ سب بہتان ہے۔ میں نے کسی اُستاد یا پروفیسر کو ایسا کرتے نہیں دیکھا۔"

"آپ پھر بھول گئے۔ اجی قبلہ! میں اساتذہ اور پرفیسروں کی نہیں گدھے اُستاد اور گدھے پروفیسروں کی بات کر رہا ہوں۔"

"اچھا..... اچھا......... اب یہ بتائیے کہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھ کر آپ کیا کریں گے۔"

"معاف کیجئے میرا خیال تھا صرف گدھے بات کو جلدی سے نہیں سمجھتے معلوم ہوتا ہے یہ مرض انسانوں میں بھی تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آہا!" گدھے نے ہنستے ہوئے کہا "اب بھی نہیں سمجھے۔ اجی جناب! مقابلے کے امتحان میں بیٹھ کر سوائے اس کے اور کیا کیا جاتا ہے کہ اُمیدوار افسر بن جاتا ہے۔ چنانچہ میں بھی افسر بن جاؤں گا۔"

"افسر بن کر کیا کرو گے۔"

"آہا!... پھر وہی بے تکا سوال ــــ خیر جواب دیئے دیتا ہوں۔ حضور کان کھول کر سن لیجئے افسر بن کر میں افسری کروں گا۔ افسری کرنے کا مطلب تو آپ خوب سمجھتے ہیں نا۔ من مانی کرنا۔ انصاف، قانون اور قاعدہ افسر کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ جو کچھ کہتا اور کرتا ہے وہی قانون اور قاعدہ ہوتا ہے ــــ اور معلوم ہونا چاہیئے اسی کو انصاف بھی کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے حرام خوری ہر افسر کی عشرت کا محل تیار ہوتا ہے۔ چنانچہ میں بھی افسر بن کر یہی کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اور... اور......"

"خاموش کیوں ہو گئے۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو"

"مَیں کہنا یہ چاہتا تھا کہ...... کہ...... کہ اگر افسری نہ ملی تو پھر ضرور کسی سکول یا کالج میں اُستاد ہو جاؤں گا۔ تعلیم ہی وہ غریب پرور شعبہ ہے جہاں ہر کس و ناکس کی کھپت ہو جاتی ہے"

گدھے نے یہ کہہ کر زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا "ڈھی چوں...... ڈھی چوں..... ڈھی...... ڈھی ڈھی چوں" ___ مجھے اس پر سخت غصّہ آیا۔ سوچا کیوں نہ سب سے پہلے اسی نامعقول گدھے کو اپنی ذات سے نکال باہر کروں۔ اس خیال کے آتے ہی اُسے کان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا چاہا لیکن اُس نے چشم زدن میں اپنا کان چھڑا کر اس زور سے میرے دولتی ماری کہ مَیں فضا میں اُچھل کر دُور جا پڑا۔ میرے سر سے خون بہنے لگا ___ میں ایک بار تو گھبرا گیا لیکن جیسے ہی میری نظر اپنے اردگرد پڑی، مجھے یک گونہ تسلی ہوئی۔ اتفاق سے میں ایسے مقام پر آ گرا تھا جو ہسپتال قسم کی کوئی جگہ تھی۔ میرے آس پاس بہت سے مریض پڑے تھے۔ کچھ درد و کرب سے چلّا رہے تھے، کچھ دم توڑ رہے تھے اور کچھ پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ مَیں نے جب دیکھا کہ میرے جسم سے زیادہ ہی خون بہہ رہا ہے تو دُہائی دینی شروع کی کہ ڈاکٹر صاحب کو لاؤ مَیں چیختا رہا لیکن کسی نے مطلق پروا نہ کی۔ نزدیک سے ایک نرس گزری تو میں نے اُس کا دامن پکڑ لیا اُس نے دامن چھڑاتے ہوئے کہا "کیا مصیبت ہے؟ ۔ کیوں اس طرح شور مچا رہے ہو" میں نے جواب دیا "خدا کے لئے ڈاکٹر صاحب کو جلدی بھیجو"

"آخر ڈاکٹر کے بھی جان ہے۔ وہ مشین نہیں ہے کہ ہر وقت کام ہی کرتا رہے۔ ابھی کچھ دیکھ کر آئے ہیں۔ ذرا آرام کریں گے۔ دوستوں سے گپ شپ لگائیں گے۔ ایک دو اپنے پرائیویٹ مریضوں کو دیکھیں گے پھر اس طرف بھی آجائیں گے اور ہاں تم تو بالکل تازہ مریض معلوم ہوتے ہو۔ تمہارا واویلا کرنا بالکل بے معنی ہے" آس پاس کے تمام مریضوں کی طرف اشارہ کر کے اُس نرس نے کہا "ڈاکٹر صاحب پہلے ان مریضوں کو دیکھیں گے تب کہیں جا کر تمہاری باری آئے گی"

"لیکن ان میں سے بہت سے تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اور باقی کے لبوں پر جان ہے"

"پھر کیا ہوا۔ مُردہ مریض کا علاج نہیں ہوتا؟ - کم سے کم اُسے ٹیکہ تو لگایا جاسکتا ہے"

"مَیں کچھ نہیں جانتا مجھے جلدی سے ڈاکٹر کو دکھاؤ"۔

"تو پھر پرائیویٹ طور پہ دکھالو"۔

"مَیں تمہارا مطلب نہیں سمجھا"

"۳۲ روپے فیس دو ڈاکٹر صاحب ابھی تمہیں دیکھ لیں گے"

"میں غریب آدمی ہوں"

"غریب ہو تو آرام سے پڑے رہو۔ شور کیوں مچاتے ہو" یہ کہہ کر نرس جانے لگی تو میں نے پھر اُس کا دامن پکڑ لیا۔ "مجاتی کہاں ہو۔ میری بات تو سنو"

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو" وہ ایک ادائے خاص سے بولی۔ میں نے کہا

"ہمارے ہاں تو ڈاکٹر غریب اور امیر کے امتیاز کے بغیر فوراً مریض کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ اُن میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ وہ لالچی ذرا نہیں ہوتے"

"آپ انسان ڈاکٹروں کی بات کر رہے ہیں لیکن معلوم ہونا چاہیئے آپ اس وقت ایک گھٹ ڈاکٹر کے پاس آئے ہوئے ہیں"

میں نے جب دیکھا کہ یہاں کوئی شنوائی ہوتی نظر نہیں آتی تو ہمت کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ سر پکڑے جا رہا تھا کہ مجھے ایک سمت سے آواز آئی "ابا جی! اب فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے نوکری مل گئی ہے۔ چند دنوں میں دیکھنا آپ کے لئے ایک عمدہ سی کوٹھی بھی بنوادوں گا اور سیر کرنے کے لئے کار بھی لے دوں گا"

"لیکن بیٹا! تمہیں نوکری تو صرف ساڑھے چار سو روپے ماہوار کی ملی ہے۔ اس رقم سے کیا ہوتا ہے۔ کنبے کی دال روٹی بھی پوری نہیں ہوگی"

"آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ میری نوکری عام نوکریوں جیسی نہیں ہے۔ میں ایک انجنیئر ہوں۔ پورا سب ڈویژن میرے ماتحت ہوگا۔ کوٹھی اور کار تو زیادہ سے زیادہ چھ مہینے کی بات ہے۔ اور ہاں کار کا وعدہ تو ابھی ایک ٹھیکیدار مجھ سے کر گیا ہے"

"بیٹا! مجھے یقین نہیں آرہا ہے"۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ دراصل بڑھاپے نے آپ کا حافظہ بالکل خراب کر ڈالا۔ ماموں جی صرف اوورسیر ہی تو تھے، لیکن دیکھ لیجئے اُن کے گھر میں خدا کا دیا کیا کچھ نہ تھا۔ فرج۔ ریڈیوگرام۔ ٹیپ ریکارڈ۔ اور بجلی کا نہ جلنے ہزاروں قسم کا سامان۔ آخر عمر میں تو انہوں نے ایک بڑی سی کار بھی رکھ لی تھی۔ جس طرح انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش کی ہے ہم تو کبھی خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے"۔

"برخوردار! اپنے ماموں کی کیا بات کرتے ہو۔ وہ تو بہت سمجھ دار آدمی تھا"۔

"موصوف کے تجربات کی بنا پر ہی میں نے عرض کیا ہے۔ مرنے سے چند روز پہلے مرحوم نے اپنے تمام گُر میرے ذہن نشین کرا دیئے تھے۔ فرماتے تھے کہ بیٹا کوئی سڑک بناؤ یا عمارت پُل بناؤ یا تالاب، کبھی ایسا نہ بنانا کہ کچھ مہینے یا ایک سال سے زیادہ ٹھہرے۔ تمہارا بنایا ہوا کام جس قدر ناپائیدار ہوگا اسی قدر تم پائیدار ہوتے چلے جاؤ گے۔ ٹھیکیدار کو ہمیشہ اپنے ہاتھ پر رکھنا بلکہ بہتر یہ ہے کہ اپنے کسی عزیز کو ٹھیکیدار بنوا دینا۔ پھر اللہ اپنا فضل کرے گا"۔ گدھے کی یہ گفتگو سن کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے نہایت جذبات میں آکر کہا "تم یہ جھوٹ بول رہے ہو۔ انجنیئروں کو بلاوجہ بدنام کر رہے ہو۔ صحیح معنوں میں انجنیئر وہ ہے جو اپنے ملک کو مضبوط اور مستحکم بنانے میں دن رات ایک کر دیتا ہے۔ اُس کی زیرِ نگرانی بنی ہوئی چیز اپنے وقت سے پہلے کبھی خراب نہیں ہو سکتی۔ انجنیئر ملک و قوم کا گراں بہا سرمایہ ہوتے ہیں۔ وہ ملک و قوم کو لوٹتے نہیں بلکہ اُس کی تقدیر بناتے ہیں۔ وہ فی الواقعی وطن و ملّت کے معمار ہوتے ہیں۔ میں اپنے جس انجنیئر سے مِلا ہوں اُس میں ان صفات کو بدرجۂ اتم پایا ہے"۔

"آپ نے کسی انسان قسم کے انجنیئر کو دیکھ لیا ہوگا میں تو اپنے ہم جنس یعنی گدھے انجنیئروں کی بات کر رہا ہوں۔ یاد رکھئے کوئی گدھا انجنیئر اتنا بے وقوف نہیں ہوتا کہ وہ کام ٹھیک بنوائے اور ٹھیکیدار سے حصہ بٹائی نہ کرے"۔

کچھ چوٹ کی وجہ سے اور کچھ اس قسم کی باتیں سن کر میرا سر چکرانے لگا۔ میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا میں اپنی ذات کے اس لق و دق صحرا سے کس طرح باہر نکلوں کہ ایک بوڑھا سا گدھا

میرے پاس آیا اور کہنے لگا "میری پیٹھ پر سوار ہو جایئے میں آپ کو جہاں آپ چاہتے ہیں چھوڑ آؤں گا۔"

"تم مجھے گرا تو نہیں دو گے اور اگر میں گر گیا، دولتی تو نہ مارو گے؟"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ کوئی جہاں دیدہ گدھا اپنے سوار کو نہیں گراتا۔ رہا دولتی مارنے کا سوال تو معاف کیجئے آپ میں رکھا ہی کیا ہے جو آپ کے دولتی مار کر کچھ مزہ آئے۔ غالباً آپ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ عموماً گدھا حسد، رقابت یا دشمنی کی بنا پر دولتی نہیں چلاتا، وہ جب بھی کسی انسان کے دولتی مارتا ہے تو سمجھ لیجئے اُس کی طبیعت موجوں پر آئی ہوئی ہے اور وہ محض دل لگی کر رہا ہے۔"

میں اُس گدھے پر سوار ہو گیا۔ گدھا آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا اور نیند کی وجہ سے میری آنکھیں بند ہونے کو تھیں کہ اچانک ایک شور سنائی دیا۔ مَیں نے پوچھا "یہ کیسا ہنگامہ ہے؟" گدھے نے جواب دیا "آپ اس کی پرواہ نہ کریں۔ چند سیاستدان جمع ہیں اور آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ہر کوئی اپنے فائدے کی بات کرتا ہے۔ کسی کو یہ فکر نہیں ہے کہ عوام پر کیا گزر رہی ہے۔"

"مَیں تمہاری بات تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ سچا سیاست دان کبھی خود غرض نہیں ہوتا۔ اُسے عوام کے دُکھ درد کا ہر لحظہ خیال رہتا ہے۔ رہا اختلاف تو یہ کوئی بُری چیز نہیں ہے۔"

"یہ بات آپ کے سیاست دانوں کے بارے میں درست ہو سکتی ہے۔ میں تو اپنے سیاستدانوں یعنی گدھے سیاست دانوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ گدھے سیاست دان کو اپنے سوا دنیا میں اور کوئی نظر نہیں آتا۔ اُس کا اختلاف اور لڑائی بھی نظریاتی نہیں ہوتی۔ وہ لڑتا بھی ہے تو اپنے فائدے کے لئے۔ عوام سے تو خیر اُس کا کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو انہیں صرف اپنے مطلب کے لئے استعمال میں لاتا ہے۔ بے غیرتی اور عیاری اُس کی دو بڑی خصوصیات ہیں جن پر ناز کرتے ہوئے وہ اکثر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔"

"گدھے بھائی! اس ذکر پر لعنت بھیجو کوئی اور بات کرو۔ اللہ کے کرم سے ہمارا کوئی سیاستدان ایسا نہیں ہے تم جانو تمہارے گدھے سیاست دان جانیں۔ ہمارا ان سے کیا واسطہ؟"

ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے چلے جا رہے تھے کہ ہمیں ناچ گانے کی آواز آئی۔ گدھے نے بتایا

یہ ایک بہت عمدہ ہوٹل ہے۔"

"چلو اندر چلتے ہیں" میں نے کہا

گدھا بولا "میں اور آپ اس میں نہیں جا سکتے۔ یہ بہت مہنگا ہے۔ ویسے میں آپ کو باہر ہی سے نظارہ کرا سکتا ہوں۔ بڑے بڑے شیشوں میں سے سب کچھ نظر آ رہا ہے۔ ذرا غور سے دیکھئے"

"ہاں .....ہاں ..... تم ٹھیک کہہ رہے ہو"

"سامنے دیکھئے"

"دیکھ رہا ہوں"

"وہ جو ریشمی کپڑوں میں ملبوس ایک موٹا سا گدھا بیٹھا ہے، بہت بڑا صنعت کار ہے"

"کون سا؟ ..... کون سا؟"

"وہ جس کے سامنے دو حسین لڑکیاں بیٹھی ہیں اور ان حسین لڑکیوں کے درمیان جو سوٹ پہنے ہوئے ایک سڈول جسم اور گورے رنگ کا گدھا بیٹھا ہے معلوم ہے یہ کون ہے؟"

"نہیں مجھے معلوم نہیں"

"یہ گدھا ایک بہت بڑا افسر ہے"

"اور ان سے ذرا ہٹ کر دوسری میز پر جو ایک شریف سی مخلوق بیٹھی ہے یہ کون ہے؟"

"آپ ان کو نہیں جانتے؟ اجی جناب! یہ ہم گدھوں کے مذہبی پیشوا ہیں۔ علم و آگہی سے ان کو بیر ہے۔ جہالت اور منافقت ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اگر یہ کچھ دن اور زندہ رہ گئے تو ہمیں ترقی یافتہ قوموں سے کئی ہزار سال پیچھے لے جائیں گے"

"لیکن ان کے چہرۂ اقدس پر تو ڈاڑھی تھی وہ کہاں چلی گئی"

"یہ جب بھی ایسی جگہ آتے ہیں ڈاڑھی اُتار کر جیب میں رکھ لیتے ہیں"

"کیا ان کی ڈاڑھی اصلی نہیں"

"ان کی کوئی چیز بھی اصلی نہیں ہے۔ یہ نقل پر زیادہ ایمان رکھتے ہیں" گدھے کا یہ جملہ سن کر میں نے

بڑے ناز سے کہا" گدھے میاں! تم اپنے بارے میں خواہ کچھ کہو۔ ہمیں تو فخر ہے کہ ہمارے افسر، ہمارے سیاست دان، ہمارے صنعت کار اور دیگر شعبوں کے لوگ غرض سب کے سب اپنا اپنا کام نہایت دیانتداری سے سرانجام دیتے ہیں۔ اور ہمیں اُن سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ اور رہے ہمارے مذہبی پیشوا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ انہی پاک ہستیوں کی وجہ سے ہمارا قومی وجود قائم ہے۔ ہماری زندگی کی ساری اُمنگیں اور ولولے انہی متبرک نفوس کا عطیہ ہیں۔ یہ نہ ہوتے تو۔۔۔" میں ابھی اپنا فقرہ پورا کر ہی رہا تھا کہ گدھا بولا:

"قطع کلام ہوتا ہے ایں پوچھ سکتا ہوں۔ آپ کا بھی کوئی مذہب ہے؟" اس سوال پر میں نے آگ بگولا ہو کر کہا "نابنجار گدھے! تو نے یہ کیا سوال کر دیا"

جناب گستاخی معاف۔ ناراض نہ ہوں۔ میرے سوال کا جواب دیں۔ ورنہ مجھ سے سن لیں بقول نطشے مذہب صرف زبانی باتیں بنانے کا نام نہیں ہے۔ مذہب تو اعلیٰ انسانی قدروں کو اپنی زندگی میں رچانے اور بسانے کا نام ہے۔"

میں چیخ کر بولا "میں کہتا ہوں بدتمیز گدھے خاموش ہو جا!" میں نے یہ الفاظ اس زور سے کہے کہ میرا وہ عالم فاضل دوست جو ابھی کچھ دیر پہلے میرے پاس سے اُٹھ کر گیا تھا، کمرے میں ہنستے ہوئے داخل ہو کر کہنے لگا:

"یار! میں اپنی عینک یہاں بھول گیا تھا وہ لینے کے لئے آیا تو باہر بڑی دیر سے کواڑ پیٹ رہا ہوں لیکن تم نے ایک نہیں سُنی۔ کیا گھوڑے بیچ کر سو گئے تھے؟"

میں نے جواب دیا "میں سویا نہیں تھا تمہارے کہنے کے مطابق میں نے اپنی ذات میں ذرا جھانک کر دیکھا تھا ـــــ خدا محفوظ رکھے یہاں تو بُرا حال ہے۔ لیکن میں اب بھی کہتا ہوں تمہاری یہ بات بالکل غلط ہے کہ ہر انسان کی ذات میں ایک گدھا پوشیدہ ہے۔ ہاں اگر تم یہ کہو کہ تمہاری ذات میں ایسی کوئی خرابی ہے تو میں تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ واقعی میری ذات کا تو دیوالیہ نکل چکا ہے" دوست بولا "چلو یار تم نے اپنی ذات کا تو کچھ نظارہ کر لیا۔ لیکن یاد رکھو اگر تم گدھے کو یا گدھوں کو اپنی ذات سے

نکالنا چاہتے ہو تو گدھے کے بچے سے پیار کرنا چھوڑ دو۔ شاید تم نہیں جانتے کہ ابتدا میں ہر بُرائی گدھے کے بچے کی طرح معصوم اور خوب صورت نظر آتی ہے۔ اگر شروع ہی سے تم اس بات کا خیال رکھتے تو آج تمہاری ذات میں اتنے سارے گدھے جمع نہ ہو گئے ہوتے۔ بہر حال اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تھوڑی سی ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔" دوست سمجھائے جا رہا تھا اور مجھے سخت بوریت کی وجہ سے جمائی پر جمائی آئے جا رہی تھی۔

رات اور سورج

"سورج نکلا تھا؟"

"یقیناً"

"لیکن اتنی جلدی چھپ کیسے گیا؟"

"ہاں! یہ ذرا سوچنے والی بات ہے"

"پھر ذرا سوچ کر بتایئے نا"

"دن چھوٹے بڑے بھی تو ہوتے ہیں"

"ٹھیک کہتے ہو"

"بس ہماری قسمت میں ایک لمحہ کا دن تھا"

"مگر سورج کے طلوع ہونے کے انداز سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ ہمارے نصیبوں میں اسقدر مختصر دن ہوگا"

"اب اس سوال سے فائدہ؟"

"تم ہمیشہ فائدے اور نقصان میں اُلجھ کر رہ جاتے ہو"

"چلیئے ان سے بلند ہو کر کوئی بات کریئے"

"باتیں تو بہت کی جا سکتی ہیں"

"پھر کرتے کیوں نہیں؟"

"تاریکی سے دم گھٹتا جا رہا ہے۔ دُور دُور تک روشنی کا نام و نشان نہیں۔"

"ستارے تو بہت سے نکلے اور پھر ڈوب گئے لیکن حضور نے نگاہ اُٹھانے کی زحمت نہ فرمائی۔"

"میں بے خبر ضرور رہوں لیکن اتنا بھی نہیں ۔۔۔ معلوم ہونا چاہیئے میرے پاس تمہارے ایک ایک ستارے کا حساب ہے۔"

"میرے ایک ایک ستارے کا حساب؟"

"جی ہاں"

"اُن ستاروں سے آپ کا کوئی تعلق نہیں؟"

"ضرور ہے لیکن میں ان کو ستارے نہیں سمجھتا۔"

"بہت خوب یہ ستارے نہیں تو اور کیا ہیں؟"

"جو چاہے سمجھ لو۔"

"میں تو انہیں ستارے ہی کہوں گا۔"

"اسی لئے تو میں نے تمہارے ستارے کہا ہے۔"

"مگر جناب ذرا پلک اُٹھا کر تو دیکھئے۔"

"کیا دیکھوں۔"

"آسمان میں اب بھی بے شمار ستارے جھلملا رہے ہیں۔"

"مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔"

"یہ صاف ہٹ دھرمی ہے۔"

"میری نیت پر شک نہ کرو۔"

"آپ کا خیال ہے فضا کا نظام ستاروں کے بغیر چل رہا ہے؟ ۔۔۔ خدا کے لئے میری آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کیجیے۔"

"اور اپنی آنکھوں کا کیا کروں؟"

"فی الحال سمجھ لیجئے کہ آپ کی آنکھیں نہیں ہیں۔"

"اچھا سمجھ لیا۔"

"تو پھر دیکھئے دائیں طرف پھیلے ہوئے ستارے آسمان کی انتظامیہ کے ذمہ دار ہیں۔"

"لیکن یہ ڈگمگا کیوں رہے ہیں؟ کیا ان کی زندگی ختم ہو رہی ہے؟"

"ایسی بات نہیں یہ خوف سے تھر تھرا رہے ہیں۔ ویسے انتظامیہ کے ستاروں کا کمال یہ ہے کہ جیسا ماحول دیکھتے ہیں ویسا بن جاتے ہیں ۔۔۔ ان میں ذلیل ترین غلاموں کی خصوصیات بھی پوری طرح پائی جاتی ہیں یعنی وقت پڑنے پر یہ آپ کے جوتے بھی چاٹنے کو تیار ہو جائیں گے! اور جب ان کی بن آئے گی تو خود کو خدا کہلانے سے بھی نہ چونکیں گے۔ ان کی فرعونیت اپنی مثال آپ ہے۔"

"ماشاء اللہ۔"

"اب ذرا بائیں طرف دیکھئے۔"

"دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ ستارے فضا کی سیاست چلا رہے ہیں۔"

"انتظامیہ کے ستارے تو اپنی جگہ کچھ ٹھہرے ہوئے بھی نظر آتے ہیں لیکن ان سیاسی ستاروں کا حال تو بقول شاعر اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے والا دکھائی دے رہا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ۔۔ سیاست میں اسی طرح ہوا کرتا ہے۔ جب موقعہ دیکھا ڈبکی لگائی جب فضا کو سازگار پایا باہر نکل آئے۔"

"یہ تو بہت بڑی خود غرضی اور عیاری ہے۔"

"رات کی سیاست میں ان صفات کا ہونا لازمی ہے۔"

"رات کا ذکر آیا ہے تو میرا دم پھر شدت سے گھٹنے لگا ہے۔"

"آپ کو ابھی روشنی کا احساس نہیں ہوا۔"

"بالکل نہیں۔"

"اچھا پھر پوری فضا پر نگاہ ڈال کر دیکھیے۔"

"میری سانس اُکھڑ رہی ہے۔"

"بے فکر رہیے آپ مرتے نہیں۔ اتنے ہی غیرت مند ہوتے تو اب سے کہیں پہلے کوچ کر گئے ہوتے۔"

"بھئی مذاق نہ اُڑاؤ۔ مجھے روشنی کا اتا پتا بتاؤ؟"

"کیا فضا میں چاق و چوبند ستارے نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

"ہاں نظر آ رہے ہیں۔"

"یہ محافظ ستارے ہیں۔ ہر وقت اپنا سینہ تانے رکھتے ہیں۔ انہوں نے فضا سے کچھ نہیں حاصل کیا بس متروکہ جائداد کو ذرا چالاکی کے ساتھ الاٹ کرایا ہے۔ فضا میں جس قدر خلا دکھائی دے رہا ہے تمام کا تمام ان محافظ ستاروں کی ملکیت ہے۔"

"یہ تو حفاظت کرتے کرتے اچھے خاصے جاگیردار بن گئے ہیں۔"

"آخر ان بے چاروں کو اس کے صلے میں کچھ ملنا بھی تو چاہیئے تھا۔"

"محافظ ستاروں میں ایک ستارہ کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آ رہا ہے۔"

"کیوں نہ ہو۔ اس ستارے نے تو فضا پر ایک عرصے تک حکومت کی ہے۔"

"کہتے ہیں اس نے فضا کو خراب بھی بہت کیا۔"

"یہ بات بھی درست ہے۔"

"پھر یہ فضا میں موجود بھی ہے، اس سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں؟"

"رات کی عملداری میں کون کسی سے پوچھ گچھ کر سکتا ہے۔"

"دوست! روشنی کا سراغ نکالو، ورنہ یقین کرو میں مر جاؤں گا۔"

"غالباً ابھی تک آپ نے اپنے عین سامنے نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔"

"اب دیکھ لیتا ہوں۔"

"ہاں ضرور دیکھیے۔ یہ ستارے فضا میں عدل و انصاف قائم کرتے ہیں۔"

"اسی لئے ان میں سے کرنیں پھوٹتی نظر آ رہی ہیں۔ کیوں نہ ہو، عدل و انصاف کا عمل میں آنا تو بڑی بات ہے ایسا ذکر بھی چل پڑے تو دل میں چاندنی کھلنے لگتی ہے مگر ان ستاروں کو جتنا روشن ہونا چاہیئے تھا یہ اتنے روشن کیوں نہیں ہیں۔"

"تم جانتے ہو فضا میں چیزیں ایک دوسرے سے اثر لیتی ہیں۔ ان ستاروں میں کچھ ستارے ڈنڈی مارنے کے عادی ہو گئے ہیں۔"

"ارے بھائی یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ہماری زمین پر تو عدلیہ کا تصور بہت بلند ہے۔ دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے لیکن عدلیہ اپنا معیار گرنے نہیں دیتی۔"

"تمہاری زمین کے کیا کہنے۔ میں تو غریب آسمان کی بات کر رہا ہوں۔"

"اور ہاں تم ان ستاروں کو کس نام سے پکارو گے جو کچھ دیر ہر ستارے کا طواف کرتے ہیں لیکن بعد میں وہ ستارہ ان کا طواف شروع کر دیتا ہے۔"

"یہ تاجر ستارے ہیں، ان کا معمول ہے کہ پہلے یہ خود دوسروں کے گرد گھومتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ ان کا جادو کارگر ہو گیا ہے تو یہ خود اپنے مقام پر ٹھہر جاتے ہیں اور دوسروں کو اپنے گرد چکر دینے لگتے ہیں۔"

"ساتھی! خدا کے لئے بتاؤ رات کب ختم ہو گی؟"

"وہ اتنے ستارے دیکھنے کے باوجود آپ کا شکوۂ ظلمت برقرار ہے۔"

"تم جنہیں ستارے کہہ رہے ہو وہ ستارے ہیں کہاں؟"

"ستارے نہیں تو اور کیا ہیں۔"

"یہ تو سیاہی کے ایسے داغ ہیں جو اندھیری رات میں بھی نمایاں طور پر کالے نظر آتے ہیں۔"

"لیکن مجھے یہ ستاروں کی طرح کیوں دکھائی دیتے ہیں؟"

"اس لئے کہ تم نے رات سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔"

"میں نے کسی سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ یہ زندگی کے ساتھ میرا حقیقت پسندانہ رویہ ہے۔"

"تم اس رات کو اور اس کے سر پر بقول تمہارے جھلکتے ہوئے ستاروں کو ایک حقیقت سمجھتے ہو؟"

"یہ رات ایک حقیقت نہیں ہے تو پھر اس سے جناب کا دم کیوں گھٹا جا رہا ہے؟"

"اگر احساس کی ذرا سی کرن بھی موجود ہو تو انسان کو اپنا دم اس وقت زیادہ گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے، جب لوگ کسی بڑے فریب کو ایک حقیقت سمجھ بیٹھتے ہیں۔"

"تو گویا یہ رات اور اس میں چمکتے ہوئے ستارے تمام کا تمام فریب ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔"

"کوئی ثبوت؟"

"جس ستارے کو کہو اس کو اپنی چٹکی میں پکڑ کر تم پر اس کی حقیقت واضح کر سکتا ہوں۔"

"آ ہا ہا ہا...... آپ ستاروں کو کیسے پکڑ سکتے ہیں وہ تو بہت بلندی پر واقع ہیں۔"

"اُن کے وجود کی طرح اُن کی بلندی بھی ایک فریب ہے۔"

"اچھا تو کسی ستارے کو پکڑ کر دکھائیے؟"

"یہ لیجئے۔"

"ارے آپ نے تو کھڑے ہو کر اس کو یوں دبوچ لیا جیسے کسی درخت کی جھکی ہوئی ٹہنی سے پھل توڑتے ہیں۔"

"میں تو اسے ٹھوکر لگا کر فٹ بال کی طرح فضا میں بھی اُچھال سکتا ہوں۔۔۔"

"پھر اُچھالتے کیوں نہیں؟"

"ایسا کرنے سے اس کا پیٹ پھٹ جائے گا اور ساری فضا تعفن سے بھر جائے گی ان تمام نام نہاد ستاروں کے وجود میں خود غرضی اور ہوس کی غلاظت اس کثرت سے

اٹی ہوئی ہے کہ ذرا سی ٹھیس لگنے پر ان کا بلبلے کی طرح بیٹھ جانا یقینی ہے۔"

"مگر ٹھہریئے، یہ ستارہ تو جسے آپ نے چٹکی میں پکڑ رکھا ہے ایک شریف خاندان کا چشم و چراغ معلوم ہوتا ہے۔"

"تم اس کے حسب و نسب سے واقف ہو؟"

"صرف اتنا جانتا ہوں یہ ایک ذہین انجینیئر ہے۔

"جی ہاں پچھلی باتوں کو چھوڑیئے حال ہی میں ان حضرت نے اپنے ذہین ہونے کا یہ ثبوت دیا ہے کہ ایک جگہ سے دودھ کی نہر یعنی کہکشاں کا کنارا کمزور ہو گیا تھا۔ اسے مضبوط کرنے کے لئے صرف ساٹھ روپے کی مٹی ڈلوائی اور ساٹھ ہزار وصول کئے۔"

"یہ مبالغہ ہے۔"

"لوٹ کھسوٹ اور بے ایمانی کے دور میں ایک شریف آدمی کو ہر حقیقت مبالغہ نظر آیا کرتی ہے۔"

"کیا ایسا حال صرف انجینیئر ستاروں کا ہے؟"

"نہیں خدا کے فضل سے ہر ستارے کا حال ہذا من فضل ربی کا مصداق ہے۔ یہ تو اتفاق سے میرا ہاتھ انجینیئر ستارے پر پڑ گیا ویسے اگر برا نہ مانو تو میں کہوں گا، انجینیئر ستاروں نے فضا کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور ابھی تک پہنچا رہے ہیں۔ یہ ستارے ناجائز کمائی کو اپنے لئے کمیشن کا نام دے کر شیرِ مادر کی طرح حلال سمجھتے ہیں اور پھر لاکھوں ہضم کر کے ڈکار تک نہیں لیتے

"ایک بات پوچھوں۔"

"ضرور۔"

"ناراض تو نہ ہو جایئے گا؟"

"بھئی پوچھ کر تو دیکھو۔"

"آپ اسی آسانی سے کسی دوسرے ستارے کو بھی پکڑ سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔"

"اچھا تو پھر کسی انتظامیہ کے ستارے کو پکڑ کر دکھایئے؟"

"فی الحال ان کو پکڑنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے پہلے بھی ان کو پکڑ کر دیکھا ہے۔ اوّل تو ان کی ذات اس قدر غلاظت سے لبریز ہو چکی ہے کہ آپ انہیں اپنے قریب نہیں لا سکتے، دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اتنے حیلے بہانے اور خوشامدیں کرنا جانتے ہیں کہ انہیں ہزار مضبوطی سے گرفت میں لیا جائے، یہ کچھ دیر بعد پھر اپنے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔"

"آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ستارے کیا ہیں، چکنے گھڑے ہیں۔"

"معاف کرنا بھئی! یہ تشبیہ ان کی بے غیرتی کو پوری طرح واضح نہیں کرتی۔"

"میرا خیال ہے آپ چھوٹے موٹے ستاروں ہی کو پکڑ سکتے ہیں، بڑے ستاروں کو نہیں۔"

"نہیں یہ خیال کیسے آیا؟"

"دیکھئے نا آپ نے ہاتھ بھی مارا تو بے چارے انجینئر ستارے پر یا پھر بقول آپ کے آپ نے دفتری ستاروں کو پکڑا ہے ہیں تو اس وقت مانوں گا جب آپ کسی سیاسی ستارے پر چھاپہ مار کر دکھائیں۔"

"یہ کون سی بڑی بات ہے لیکن تم جانتے ہو فضا کی تباہی و بربادی میں جتنا ہاتھ ان سیاسی ستاروں کا ہے اتنا کسی کا نہیں۔ میں چشم زدن میں آسمان سے نوچ کر ان سب کو یا ان میں سے کسی ایک کو تمہارے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔ مگر تم ان کی قربت کیسے گوارا کرو گے۔ ان کی ذات سے تو سڑی ہوئی لاشوں کی بُو آتی ہے جس قدر چمک دمک تم ان میں دیکھ رہے ہو یہ بہت ہی سطحی ہے۔ ذرا ہاتھ لگانے سے ان کی غلیظ شخصیتیں واضح طور پر جھلکنے لگتی ہیں۔ ان کی ذات کیا ہے۔ سازشوں، قتل و غارت، غداریوں اور حرص و ہوس کا مجموعہ۔ کیا میرے اس بیا

کے بعد بھی نہیں ان کو قریب سے دیکھنے کی تمنا ہے؟"

"ارے یہ آپ نے کیا کر ڈالا؟ مجھے بھی آسمان پر ستاروں کی بجائے سیاہ داغ نظر آنے لگے ہیں میرا بھی دم گھٹنے لگا ہے۔"

"دم گھٹنا ایک نیک فال ہے۔"

"جلدی سے بتایئے صبح کب ہوگی؟ سورج کب نکلے گا؟ واقعی مجھے سانس لینا دشوار ہو رہا ہے۔"

"معلوم ہونا چاہیئے کہ سورج نہ کبھی نکلتا ہے اور نہ کبھی ڈوبتا ہے۔"

"یہ کیا پہیلیاں بوجھنی شروع کر دیں۔"

"پہیلیاں نہیں حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔"

"اگر سورج نکلتا ڈوبتا نہیں تو ہمیں رات کے اندھیروں نے اپنے نرغے میں کیسے لے رکھا ہے؟"

"سب تمہاری اپنی زد میں ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

"بہت سیدھی سی بات ہے۔ کسی حصۂ زمین پر اسی وقت رات کے اندھیرے چھاتے ہیں جب وہ حصۂ زمین سورج سے منہ موڑ لیتا ہے۔"

"آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ طلوع و غروب سے سورج کا کوئی تعلق نہیں وہ تو سدا بہار ہے ہر وقت اپنی روشنی فضا میں بکھیرتا رہتا ہے۔"

"تم سچ کہتے ہو سورج کے سخی اور کریم ہونے میں کس کافر کو شک ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم اپنے آپ کو سورج کے سامنے لاتے ہوئے بڑی طرح ڈرتے ہیں۔"

"آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"روشنی روشنی پکارنا اور اس کا تقاضا کرنا آسان ہے۔ روشنی کے سامنے آنا سخت دشوار۔ ہم خود کو روشنی میں لے کر آتے ہیں تو ہماری حقیقت کھل جاتی ہے۔ اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ ایسا ہو۔ دراصل ہماری حقیقت ڈھول کا پول بن چکی ہے۔ اور تم جانتے ہو۔ کسی کی خواہش نہیں

نہیں ہوتی کہ اس کا پول کھلے ـــــ اچھی طرح دیکھنا تو بڑی بات ہے ہم میں اتنی ہمت بھی نہیں کہ خود پر ایک بھرپور نگاہ ہی ڈال سکیں اور اسی کم ہمتی کے باعث ہم سورج کی طرف سے منہ موڑے ہوئے ہیں اور رات کے اندھیروں میں مسلسل بھٹکتے اور ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں"

"روشنی سے ڈرنے کی بات اچھی طرح واضح نہیں ہوئی"

"دراصل روشنی کو ہم اپنا حق تو سمجھتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ روشنی ہم سے بہت بڑا مطالبہ بھی کرتی ہے"

"وہ کیا؟"

"روشنی کا سب سے بڑا مطالبہ ذمّہ داری ہے۔ جو شخص زندگی کی ذمّہ داریاں قبول نہیں کرسکتا اس میں کبھی روشنی کا سامنا کرنے کی ہمّت پیدا نہیں ہوتی۔ معلوم ہے روشنی کسے کہتے ہیں؟"

"وہ چیز جس کی بدولت ہم دیکھنے کی صلاحیت کو کام میں لاتے ہیں"

"انسانی زندگی میں جن چیزوں سے نُور پیدا ہوتا ہے وہ صداقت، خلوص، دیانت داری ایثار اور بقول قائداعظمؒ اتحاد، تنظیم اور یقین محکم ہیں اور ان میں سے ہر چیز اپنی اپنی جگہ ایک بڑی ذمّہ داری ہے"

"گویا بلند انسانی اقدار کا دوسرا نام روشنی ہے"

"اور ہم ان سے منہ موڑے ہوئے ہیں"

"تو پھر آیئے روشنی کی طرف منہ کرتے ہیں"

"تنہا نہیں ایک ساتھ"

"مجھے اتفاق ہے"

"اچھا تو پھر تیار ہو جایئے"

"میں تیار ہوں"

"ایک ..... دو ..... تین" ـــــ لیکن سورج نے دیکھا کہ اس کی طرف سے مُنہ موڑنے والے اُسی طرح مُنہ موڑے کھڑے ہیں حالانکہ ذرا ہمّت سے کام لیں تو اُن کی دنیا میں صبح درخشاں کا نزول کوئی بڑی بات نہیں۔

ہتکِ عزّت

آج کل جانوروں میں انصاف کی حس کچھ زیادہ ہی تیز ہوگئی ہے، ایسا کیوں
ہے اِس کا سیدھا سا جواب یہی ہے کہ بنی نوعِ انساں میں اِس حس کا خاتمہ ہوتا جا
رہا ہے — پھر سوال پیدا ہوتا ہے ایسا کیوں ہے؟ جواب کے لیے کسی جانور
کا انٹرویو لینا ضروری ہے۔
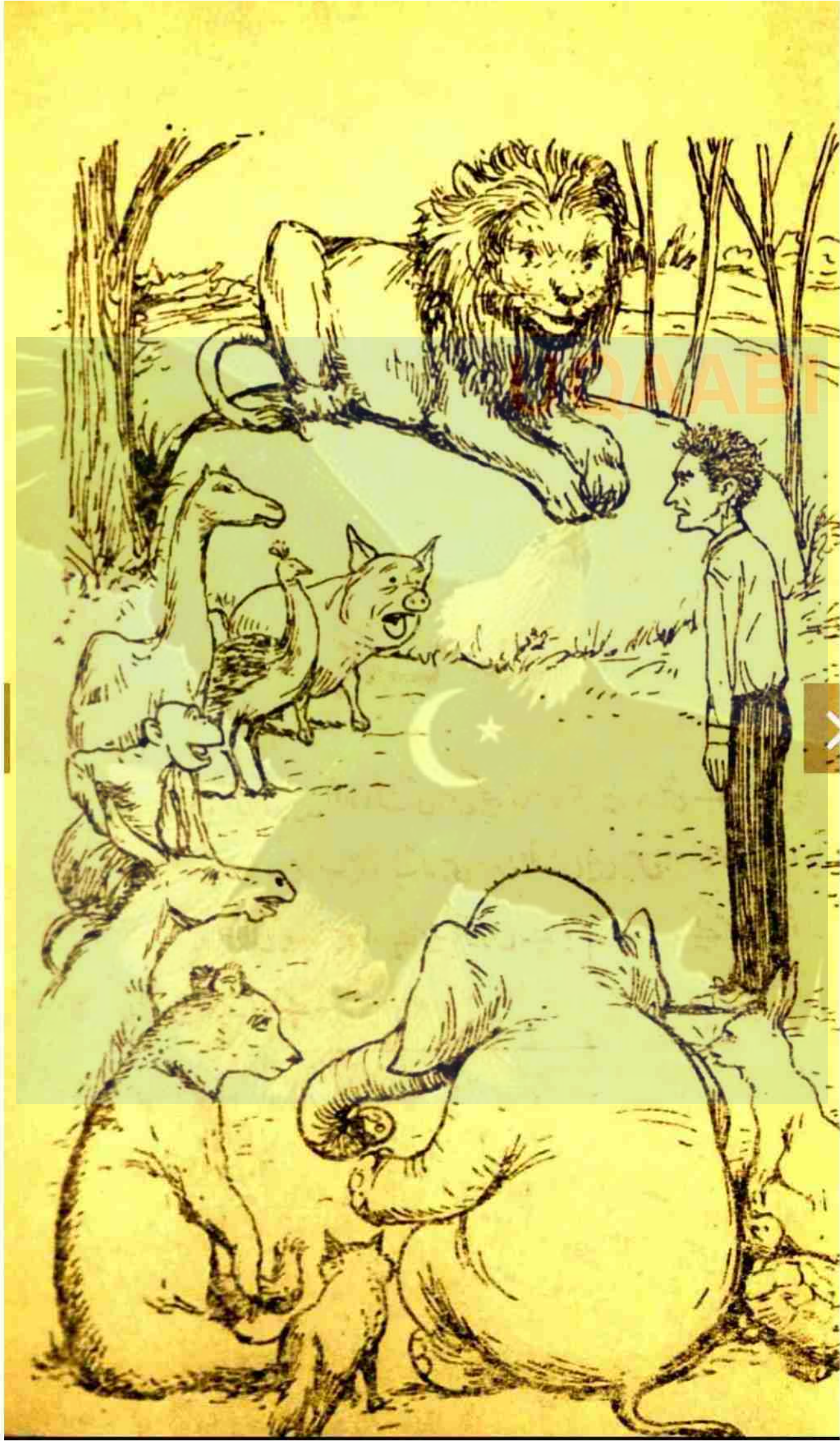
ہتکِ عزّت

کئی دن سے شہر میں یہ افواہ بُری طرح پھیلی ہوئی تھی کہ ہر روز کسی نہ کسی شخص کو اغوا کر لیا جاتا ہے لیکن اس افواہ سے خوف و ہراس کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تھی۔ اوّل تو جس کو اغوا کیا جاتا وہ ہمیشہ کوئی مرد ہوتا، دوسرے اغوا ہونے کے بعد وہ اُسی روز بخیر و عافیت اپنے گھر پہنچ جاتا۔ میں نے جب صدیقی سے اس کا ذکر کیا تو وہ حسبِ معمول طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے فرمانے لگے "مشکور صاحب کمال ہے ——— آپ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ایسی افواہوں پر یقین کرتے ہیں" میں نے کہا "بعض افواہیں ایسی ہوتی ہیں جن پر خواہ مخواہ یقین کرنے کو جی چاہتا ہے" صدّیقی مزید ہنستے ہوئے بولے "یہ آپ نے کون سی نئی بات کہی، حضرت! بعض نہیں ہر افواہ ایسی ہوتی ہے جس پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر ایک لمحہ توقف کے بعد کہا "میں پوچھتا ہوں بقول آپ کے ہر روز کوئی نہ کوئی اغوا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ شروع ہوئے بھی کئی دن گزر چکے ہیں۔ آج تک آپ کو کوئی ایسا شخص ملا جس کے ساتھ ذاتی طور پر اغوا کی یہ واردات پیش آئی ہو؟" میں نے کہا ہمارے محلّے ہی میں سے ایک شخص اغوا ہوا تھا، لیکن اتفاق کی بات ہے میں اس سے آج تک نہ مل سکا "آپ اُس سے انشاءاللہ کبھی نہ مل سکیں گے اور اگر وہ مل بھی گیا تو کہے گا بھائی جان میں اغوا نہیں ہوا تھا، بلکہ میرے دوست کا ایک دوست اغوا ہوا تھا" صدیقی نے ابھی فقرہ مکمل بھی نہ کیا تھا کہ ہمارے برابر سے گزرتے ہوئے ایک شخص نے کہا "اغوا کی یہ خبر افواہ نہیں بلکہ حقیقت ہے پچھلے ہفتے میں خود اس حادثے کا شکار ہو چکا ہوں" یہ کہہ کر اس شخص نے تیزی سے قدم بڑھائے، صدیقی

بولے "بھائی صاحب ٹھہریئے! ہمیں ذرا تفصیل سے بتایئے۔" اُس نے کہا "معاف کیجئے۔ میں جلدی میں ہوں، اس وقت آپ کو تفصیل سے کچھ نہیں بتا سکتا۔ شام ہو چکی ہے اور یہ جگہ بھی سنسان ہے عموماً اغوا کی واردات ایسی حالت ہی میں وقوع پذیر ہوتی ہے" ۔ "کیا آپ کو شام کے وقت اغوا کیا گیا تھا؟" — صدیقی نے پوچھا — اُس نے چلتے چلتے جواب دیا "میں تو دوپہر کے وقت اغوا ہوا تھا آپ لوگ آج کل سیر کے لئے شہر سے باہر نہ نکلا کریں۔"

اُس شخص کے جانے کے بعد میں نے صدیقی سے کہا "اول تو یہ کہ فوراً واپس ہو جاؤ — آگے ایک قدم نہیں بڑھاؤں گا۔ دوسرے یہ کہ آئندہ سیر کا پروگرام منسوخ ———— وہ پھر ہنستے ہوئے بولے:

"کیا فضول بات ہے! — جہاں تک واپس ہونے کا سوال ہے یہ لیجئے، ابھی واپس ہو جاتے ہیں۔ میں تو پہلے ہی سوچ رہا تھا خاصی دور آ چکے ہیں۔ آپ کو گھر کی یاد ستا رہی ہو گی ——— رہا سیر کا پروگرام منسوخ کرنے کا سوال تو جناب یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

"منسوخ سے میرا مطلب ملتوی کرنے سے ہے یعنی جب تک اغوا کی وارداتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا۔"

"آپ نے اس شخص کا یقین کر لیا؟"

"اُس نے کسی کی بات نہیں سنائی تھی، اپنا تجربہ بیان کیا تھا۔ اب بھی آپ کو اس میں کوئی شک نظر آتا ہے؟

"بہت سے لوگ افواہوں کو سچ ثابت کرنے کے لئے انہیں چشم دید بنا کر پیش کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔"

صدیقی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ اگلے روز شام کو سیر کے لئے مجھے ساتھ لینے آئے تو میں نے صاف انکار کر دیا کہ بلا وجہ اغوا ہونے کو تیار نہیں خود ہی کہنے لگے "مشکور صاحب آپ کو اس افواہ کے بارے میں مزید کچھ معلوم ہوا؟" ——— میں نے نفی میں سر ہلایا تو سلسلۂ کلام

جاری رکھتے ہوئے بولے "اس ضمن میں مجھے دو مزے دار خبریں ملی ہیں۔ اوّل یہ کہ اس صفائی سے کام ہوتا ہے کہ اغوا ہونے والے شخص کو بہت دیر بعد پتہ چلتا ہے وہ اغوا ہو چکا ہے۔ اکثر اشخاص کو واپس گھر پہنچ کر خبر ہوتی ہے کہ وہ اغوا کر لئے گئے تھے۔ دوسری مزے دار خبر یہ کہ اب تک جتنے افراد اغوا ہوئے، ان کے نام 'م' سے شروع ہوتے ہیں اور سب کا وزن مفعول پر ہے۔ یعنی مقصود، محمود، منظور، مسرور، معصوم وغیرہ۔" میں نے کہا "بس تو پھر مجھے اور آپ کو زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میرا نام مشکور ہے اور آپ کا مسعود۔" کہنے لگے "آگے تو سنیئے۔ اغوا ہونے والوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ اغوا اپنی نوعیت کا آپ ہے، اس لئے کچھ عجیب قسم کا تجربہ ہے۔"

"اس کا مطلب ہے آپ اغوا ہو رہے ہیں؟"

"لیکن آپ کے ساتھ نہیں تنہا۔"

"آدمی اغوا تو ہوتا ہی تنہا ہے۔"

"دل چسپی کی بات یہ ہے کہ اس واردات میں اکثر دو اشخاص بیک وقت اغوا کئے جاتے رہے ہیں۔"

"تب تو واقعی اغوا ہونے میں لطف آتا ہوگا۔"

"مگر آپ جیسے ڈرپوک آدمی کے ساتھ نہیں۔ خدانخواستہ میں آپ کے ہمراہ اغوا ہو گیا تو اس دل چسپ تجربے کا سارا لطف خاک میں مل جائے گا۔"

"مطمئن رہیئے آپ کی اس ساری گفتگو کے باوجود میں اغوا ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"یقین کیجئے میں بھی نہیں چاہتا آپ اغوا ہوں، اس لئے کہ لوگ کہتے ہیں یہ تجربہ ہزار دلچسپ سہی اپنی جگہ خاصا خوفناک بھی ہے۔"

تقریباً ایک ہفتے تک اسی طرح ہوتا رہا کہ صدیقی سیر کے لئے میرے پاس آتے اور میں انکار کر دیتا۔ ایک روز دوپہر سے پہلے کالج میں چھٹی ہو گئی اور وہ مجھ سے کہنے لگے "چھٹی بھی ہو گئی، موسم بھی بڑا عمدہ ہے۔ کیوں نہ اس وقت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چلو سیر کو چلتے ہیں۔" میں

نے ان سے جلدی آنے کا وعدہ لیا اور ان کے ساتھ سکوٹر پر بیٹھ کر خوش خوش سیر کے لئے روانہ ہو گئے۔
صدیقی نے شہر سے باہر آکر ایک درخت کے نیچے سکوٹر کھڑا کیا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے مجھ سے
کہنے لگے "آپ ذرا کچھ پیدل چلتے ہیں" ___ ہم باتیں کرتے کرتے ایک میل سے زیادہ فاصلہ طے کر
چکے تھے کہ ہمیں پاس ہی درخت کے نیچے ایک خوبصورت اونٹ بیٹھا دکھائی دیا۔ صدیقی بولے

کیا خیال ہے مشکور صاحب آج اونٹ کی سواری نہ کی جائے؟" میں نے کہا "کوئی مضائقہ نہیں"
صدیقی نے اونٹ والے کو آواز دی۔ پانچ چھ بار پکارنے کے بعد مجھ سے کہنے لگے "معلوم ہوتا
ہے، اس کا مالک جنگل میں کسی کام سے دور نکل گیا ہے۔ یوں کرتے ہیں ایک ساتھ سوار ہونے
کے بجائے باری باری اس پر سوار ہوتے ہیں۔ میں یہاں ٹھہرتا ہوں آپ سوار ہو کر سیر کر لیجئے
جب آپ آجائیں گے پھر میں اس نئے تجربے سے لطف اندوز ہوں گا۔ اس اثنا میں اس کا مالک
آگیا، تو وہ پریشان نہ ہو گا"

"پہلے آپ چلیئے، شاید آپ کے لئے یہ ایک نیا تجربہ ہو میں اس سے قبل اونٹ پر بیٹھ چکا ہوں"
میرا معقول مشورہ مانتے ہوئے صدیقی نے درخت سے اونٹ کی مہار کھولی اور اس پر سوار ہو گئے
اونٹ کھڑا ہوا تو کہنے لگے "بھائی صاحب۔ یہ اونٹ کھڑا کس طرح ہوتا ہے؟" میں نے فوراً جواب دیا
"جس طرح بیٹھتا ہے"

"آپ کی مراد یہ ہے جب اونٹ بیٹھے تو اس وقت بھی مجھے ہشیار رہنا چاہیئے" یہ کہہ کر صدیقی نے
اسے گھوڑے کی طرح ایڑ لگائی اور وہ چل پڑا ___ مجھے زیادہ پیدل چل کر کبھی لطف نہیں آیا تاہم
ایک میل کی مسافت کچھ نہیں ہوتی، لیکن میں اس وقت ذرا تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اس کے
علاوہ درخت کا سایہ بھی گھنا تھا۔ ہوا بھی مزے دار چل رہی تھی۔ مجھے نیند سی آنے لگی، لیکن
یہ سوچ کر کہیں صدیقی میرا مذاق نہ اڑائیں بیدار رہنے کی کوشش کرنے لگا ___ وہ تھوڑی
دیر بعد ہی واپس آگئے۔ کہنے لگے "اونٹ کی سواری تو بڑی دلچسپ اور مزے دار ہے۔ لوگ
خواہ مخواہ کہتے ہیں یہ تکلیف دہ سواری ہے"

"آپ نے سفر ہی کون سا بڑا کیا ہے۔"

"بحث بعد میں کر لیجئے پہلے سیر کر آیئے۔ دیر ہو گئی تو گھر میں مجھے پوچھنے والا کوئی نہیں، لیکن بھابھی صاحبہ آپ کی طبیعت ضرور صاف کر دیں گی۔"

میں اونٹ پر بیٹھا اور جنگل کی طرف روانہ ہو گیا تھوڑی دور تک تو اونٹ میری منشا کے مطابق چلتا رہا لیکن پھر ایک دم تیز ہو گیا۔ میں نے ایک دو بار اُسے روکنے کی کوشش بھی کی مگر میرے ہاتھ خود بخود ڈھیلے پڑ گئے۔ اونٹ کی رفتار تیز ضرور تھی لیکن نہایت آرام دہ۔ درختوں کے ایک بڑے ذخیرے کے پاس آ کر اونٹ رُک گیا۔ میں نے اس پر سے چھلانگ لگائی ہی تھی کہ ایک لومڑی میرے قریب سے نکل کر بھاگی۔ میں چند قدم آگے بڑھا، کیا دیکھتا ہوں ایک سفید ہاتھی کا بچہ چلا آ رہا ہے۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور چشم زدن میں اُس نے مجھے سونڈ سے پکڑ کر اپنی پیٹھ پر بٹھا لیا۔ ایک لمحے کے لئے میں خوفزدہ ہوا لیکن ہاتھی کے بچے کا رویہ کچھ اس انداز کا تھا کہ جلد ہی میرا خوف زائل ہو گیا۔ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر میں نے دیکھا وسیع میدان میں بہت سے جانور جمع ہیں اور ایک شیر بلند مقام پر عجیب شاہانہ انداز سے بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی تمام جانوروں نے شور مچانا شروع کر دیا، ہر جانور اپنی اپنی مخصوص زبان میں بول رہا تھا، لیکن کچھ اس انداز کے ساتھ کہ مجھ پہ ہر ایک کا مفہوم واضح ہو رہا تھا۔ جانور چلا چلا کر کہہ رہے تھے: "مجرم آ گیا...... مجرم آ گیا۔" ہاتھی کے بچے نے مجھے شیر کے سامنے لا کھڑا کیا۔ میں خوف سے کانپ رہا تھا شیر نے نہایت نرمی اور شائستگی سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "تمہارا نام مشکور ہے؟" میں نے عرض کیا: "جی ہاں اس خاکسار کو اس نام سے پکارتے ہیں۔"

"مسٹر مشکور! پہلی بات تو یہ ہے ہمیں تمہاری تلاش میں بڑی دیر لگی۔ ہمارے جانور تمہارے دھوکے میں شہر سے ہر روز کوئی نہ کوئی دوسرا آدمی پکڑ کر لاتے رہے جس کا ہمیں افسوس ہے ہمارے جانوروں کا کہنا ہے ہر انسان فطرتاً ایک جیسا ہے اس لئے ان میں تمیز کرنا مشکل ہے تم جانتے ہو جانور ناک، آنکھ نہیں دیکھتے فطرت کو سونگھتے ہیں۔" مجھ پر خوف سے لرزہ طاری

ہونے لگا تو شیر نے کہا "تم کسی انسان کے سامنے مُجرم کی حیثیت سے پیش نہیں ہو کہ تمہارے ساتھ بلاوجہ کوئی زیادتی ہو جائے تم اس وقت جنگل کے بادشاہ کے دربار میں کھڑے ہو اور ہم بہ نفسِ نفیس اس وقت عدالت فرما رہے ہیں۔ تمہیں ذرّہ برابر بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارے ساتھ انصاف کریں گے۔"

"کیا میں اس دربارِ عالی وقار میں مُجرم کی حیثیت سے لایا گیا ہوں؟"

"ظاہر ہے۔" شیر نے کہا۔

"میرا جرم کیا ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"تم پر میری رعایا یعنی مختلف جانوروں نے ازالۂ حیثیتِ عُرفی کا دعویٰ کیا ہے۔"

"عالی جاہ! میں جناب کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"اگر تم ازالۂ حیثیت عرفی کا مطلب بھی نہیں سمجھتے تو بچّوں کو خاک پڑھاتے ہو گے، تمہیں پروفیسر کس نے بنا دیا؟"

"عالم پناہ میں ازالۂ حیثیتِ عُرفی کا مطلب سمجھتا ہوں یعنی جانوروں نے مجھ پر ہتکِ عزت کا دعویٰ دائر کیا ہے۔"

"خوب! تو تم اپنے جُرم کی وضاحت چاہتے ہو۔"

"حضور کا سایہ ہمیشہ قائم رہے! میرا یہی مطلب تھا۔"

"ہماری رعایا یعنی جانوروں نے تم پر دعویٰ کیا ہے کہ تم اپنے مضامین میں اُن کا ذکر اس انداز سے کرتے ہو کہ اُن کی تمام عزّت خاک میں مل جاتی ہے۔"

"اے جنگل کے بادشاہِ عادل! تیری رعایا کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی...... ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی" مجمع سے آوازیں بلند ہوئیں ـــــ شیر نے سب کو خاموش کیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "تم اپنا بیان جاری رکھو۔"

"ظلِّ سبحانی! میں نے اپنے مضامین میں اور کچھ نہیں کیا۔ انسان کو مختلف جانوروں سے تشبیہ

دی ہے :

"یہ سراسر ہماری توہین ہے۔ ہم یہ بے عزتی ہرگز برداشت نہ کریں گے یہ جانوروں نے چلّا کر کہا۔ میں نے عرض کیا۔

"سرکار والا! آپ خود انصاف فرمائیں۔ میں نے کیا جرم کیا ہے۔ جانوروں کو انسان سے تشبیہ دی، وہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے۔" یہ سن کر سارے مجمع میں قہقہے بلند ہونے لگے۔۔۔ آہا ہا ہا۔۔۔۔۔۔ انسان اور اشرف المخلوقات۔۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔۔۔ اشرف المخلوقات۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔ انسان۔۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔۔ اسے کہتے ہیں اپنے منہ میاں مٹھو۔۔۔۔۔۔ ہو ہو ہو ہو۔۔۔۔۔۔۔ کمال ہے۔۔۔۔۔ اپنے بارے میں کیا خوش فہمی ہے جناب کو۔۔۔۔۔۔ آہا ہا ہا ہا۔۔۔۔۔۔"

اس دفعہ شیر کو کھڑے ہو کر بہ بلند آواز میں بولنا پڑا، تب کہیں جا کر مجمع قابو میں آیا۔ اچھی طرح خاموشی طاری ہو گئی تو شیر نے کہا اس طرح شور مچانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے ہر جانور الگ الگ اپنا مقدمہ پیش کرے۔ سب سے پہلے میں خنزیروں کے سردار کو حکم دیتا ہوں وہ بدولت کے روبرو آئے اور بیان دے۔ ہم نے سب سے پہلے خنزیروں کے سردار کو اس لئے طلب کیا ہے کہ حاضرین دربار اچھی طرح جانتے ہیں یہ غلیظ جانور جب تک دربار میں رہے گا اپنی غلاظت سے فضا مکدر کرتا رہے گا۔" خنزیروں کے سردار نے آتے ہی جھک کر سلام کیا اور پھر باادب کھڑے ہو کر کہا "مسمّی مشکور نے بیشتر مضامین میں انسانی معاشر کے افراد کو خنزیر اور سور کہہ کر پکارا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ ہماری جنس کی بہت بڑی توہین ہے ہم ہزار بے غیرت، بے حیا اور غلاظت کا ڈھیر سہی لیکن اقتدار کے بھوکے نہیں ۔۔۔ اپنی بے غیرتی اور بے حیائی تسلیم کرتے ہیں، مگر نہایت انکسار کے ساتھ ۔۔۔ اس کے برعکس انسان بے غیرت بھی پرلے درجے کا ہے اور پھر اس کی ڈھٹائی کی بھی کوئی حد نہیں۔ اس بے حیائی کے باوجود وہ اقتدار کی ہوس رکھتا ہے۔ اب آپ خود فیصلہ فرما سکتے ہیں بے غیرتی اور بدمعاشی کے ساتھ اقتدار کہاں تک زیب دیتا ہے۔ جناب عالی! ہم بے غیرت ضرور ہیں، لیکن غنڈے نہیں۔

کیا انسان کے ساتھ ہمیں تشبیہہ دینا ہماری بے عزتی کا موجب نہیں ؟ انسان جو بیک وقت بے غیرت بھی ہے اور غنڈہ بھی۔"

"اب تم جا سکتے ہو اور اگر دربار میں بیٹھنا چاہتے ہو، تو اپنی تھوتھنی سنبھال کر رکھنا۔"

خنزیروں کے سردار سے مخاطب ہونے کے بعد شیر نے مجھ سے کہا۔

"تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو۔"

"نہیں جناب۔"

"دوسرا فریادی آئے۔" شیر کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ ایک بھیڑیا اُچھل کر میرے سامنے آیا۔ وہ میری گردن دبوچنا چاہتا تھا کہ پاس کھڑے ہوئے محافظ چیتے نے اُسے روک دیا اُدھر شیر نے ڈانٹ پلائی۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے ؟"

"حضورِ! معافی چاہتا ہوں۔ کیا کروں اس شخص کو دیکھتے ہی جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر بے قابو ہو گیا۔ غور فرمائیے جناب والا! یہ ہم بھیڑیوں کو درندہ کہتا ہے اور ہمیں انسان سے تشبیہہ دیتا ہے۔ ہم درندے ضرور ہیں، لیکن انسان سے کم ـــ بھوکے نہ ہوں تو ہم بہت کم درندگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، مگر انسان ایسا درندہ ہے جس کی درندگی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ نہ اس کی بہیمیت کی کوئی انتہا ہے اور نہ اس کی بھوک مٹتی ہے۔ ایسی صورت میں اس شخص کو کس طرح ہمت ہوئی کہ اُس نے ہمیں انسان ایسی گھٹیا مخلوق سے تشبیہہ دی ہے ـــ آپ حکم دیجئے میں ابھی اس کی تکا بوٹی کئے دیتا ہوں۔"

"عدالت میں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔" شیر گرجا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"تم اس بیان کی روشنی میں کیا کہتے ہو؟"

"کچھ نہیں جناب والا۔"

اس کے بعد مختلف جانوروں نے شیر کے سامنے اپنے اپنے انداز میں فریاد کی گومڑی

کہہ رہی تھی: غضب خدا کا، انسان مجھے فریبی اور مکار کہتا ہے، لیکن اس نے اپنے فریب اور مکاری پر دھیان نہیں دیا۔ قسم ہے اُس خالق دوجہاں کی جس نے مجھے پیدا کیا! میرے تو خواب میں بھی وہ دھوکے اور فریب نہیں آسکتے جو انسان اپنے ہم جنسوں سے آئے دن کرتا رہتا ہے؟
اُونٹ کہہ رہا تھا: مجھے کینہ پرور کہا جاتا ہے، لیکن انسان نے اپنے کینوں کی طرف انصاف کے ساتھ نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ میں تو کسی سے اُس وقت کینہ رکھتا ہوں جب کوئی مجھے بُری طرح تکلیف پہنچاتا ہے، لیکن انسان اپنے ابنائے جنس سے بلاوجہ کینہ رکھتا ہے ___ بے شمار باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں درگذر کیا جاسکتا ہے، لیکن انسان معاف نہیں کرتا اور انہیں اپنے دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ جہاں موقع ملا اور اس نے وار کیا۔"

خچر بار بار کہے جا رہا تھا: "اے جنگل کے بادشاہ! انصاف سے کام لیجئے۔ انسان مجھے اڑیل ٹٹو کا خطاب دیتا ہے، حالانکہ جس قدر سچ مچ اور اڑیل یہ خود واقع ہوا ہے، اُس کا عشر عشیر بھی میری ذات میں موجود نہیں۔ میں اڑتا ضرور ہوں، لیکن میرے اڑیل ہونے میں کوئی خاص وجہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس انسان اکثر و بیشتر نامعقول باتوں پر اڑتا ہے ___ میں نے آج تک ایسا نہیں کیا۔" بندر نے فضا میں کئی بار قلابازیاں کھاتے ہوئے فریاد کی: "انسان میرے طریق انصاف کو بندر بانٹ کے نام سے موسوم کرتا ہے لیکن اپنی بے انصافیوں کو نہیں دیکھتا۔ اس کا بنایا ہوا کوئی قانون خامیوں سے خالی نہیں اور یہ کہ اپنے قانون کی ترجمانی وہ ایسے ایسے انداز میں اپنی خودغرضی کے تحت کرتا ہے کہ بے اختیار سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ اے جنگل کے بادشاہ! آپ خود انصاف کریں اسے مجھ پر نکتہ چینی کا کیا حق ہے۔ یہ کس منہ سے انسان کو میرے ساتھ تشبیہہ دے سکتا ہے؟ میں اس سے ہزار درجے بہتر طریقے پر انصاف سے کام لے سکتا ہوں۔ اسی طرح میری نقالی پر بھی بہت تنقید کرتا ہے، حالانکہ میری نقلوں میں معصومیت اور بھولپن کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اِدھر اس کی نقالی میں ہزار بغض و حسد ہوتا ہے یا پھر بھونڈا پن۔ میری نقلیں عام طور پر مطابق اصل ہوتی ہیں اور نہایت صاف ستھری ___ ان

حقائق کے پیشِ نظر مجرم کس قانون کی رُو سے مجھے اپنی نوع سے تشبیہہ دینے کا حوصلہ کر سکتا ہے؟

شیر نے جب دیکھا جانوروں کا پورا مجمع میرے مخالف ہو چلا ہے اور میں اپنی صفائی میں ایک حرف بھی نہیں کہہ سکا، تو اس نے عدالت کی کرسی سے کھڑے ہو کر اور اپنی دُم فضا میں لہرا کر بلند آواز میں کہا: "میں نے آپ سب حضرات کے بیانات نہایت غور سے سُنے، ہو سکتا ہے ہر جانور اپنی اپنی جگہ سو فی صد درست ہو، لیکن اس ضمن میں مجھے ایک سوال کرنے کی اجازت دیجیے۔"

"آپ ہمارے بادشاہ ہیں، ایک نہیں کئی سوال کر سکتے ہیں۔" مجمع میں سے سب نے ایک زبان ہو کر کہا ـــ شیر بولا: "زیادہ نہیں صرف ایک سوال پوچھوں گا اور وہ یہ کیا میں بھی آپ کی طرح ایک جانور نہیں؟"

"بے شک ..... بے شک۔"

"لیکن مجھے مجرم سے اس طرح کی کوئی شکایت نہیں۔ اُس نے کسی انسان کو بھی مجھ سے تشبیہہ نہیں دی۔"

یہ سُن کر ایک دفعہ تو سارا مجمع سناٹے میں آگیا، لیکن چند لمحے بعد ہی لومڑی ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ شیر سمجھ گیا اور اس سے مخاطب ہوا:

"تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟ تمہیں اس کی اجازت ہے۔" لومڑی نے اپنی روایتی مکاری بالائے طاق رکھتے ہوئے نہایت خلوص کے ساتھ فرشی سلام کیا اور بولی:

"جہاں پناہ! مجرم اپنے مضامین میں بھلا انسان کو آپ سے کس طرح تشبیہہ دے سکتا تھا۔ آپ کی نمایاں صفات شجاعت، بہادری، سیر چشمی، جرات اور بے باکی ہیں اور آج کے انسان میں ان صفات کا دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا، لہٰذا حضور والا! آپ تو اپنی ذاتِ والا صفات کو ہم جانوروں سے علیحدہ ہی رکھیے۔"

لومڑی یہ کہہ کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

شیر فیصلہ سنانے ہی والا تھا کہ گدھے نے شور مچانا شروع کر دیا۔ مجمع میں ایک بار پھر قہقہے گونج اُٹھے ـــ شیر مسکراتے ہوئے بولا: "حاضرینِ محفل! اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے، آخر گدھا بھی تو جانوروں میں شامل ہے۔ اسے بھی آپ کی طرح کوئی شکایت ہو سکتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ گدھے سے مخاطب ہوا: "ہاں میاں گدھے اکمو

کیا مجرم نے تم میں اور انسانوں میں بھی کوئی مشابہت تلاش کر لی ہے کیا وہ کھلم کھلا انسانوں کو گدھا کہنے لگا ہے؟"

"سرکارِ عالی! ایسی کوئی بات نہیں"

"کیا مطلب؟" شیر نے ذرا آنکھیں نکال کر پوچھا۔ تو گدھے کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ کانپتے ہوئے بولا: "حضورِ فیض گنجور! اگر اس طرح ناراضی کا اظہار فرمائیں گے تو بندہ ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکے گا، بلکہ اندیشہ ہے میرے پیشاب اور لید سے فضا مکدر نہ ہو جائے' لہٰذا حضور سے گزارش ہے کہ ناراض نہ ہوں۔ میری عرضداشت غور سے سُن لیں"

شیر نے اپنے چہرے پر دوبارہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا "تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو بلا خوف و خطر کہو"

"تو پھر جنابِ والا! مجھ فدوی اور کمترین کو جسے سب گدھا کہتے ہیں' مجرم سے یہ شکایت ہے کہ اُس نے مجھے تمام جانوروں سے زیادہ ذلیل و خوار کیا ہے"

"وہ کس طرح؟"

"اس نے کسی انسان کے ساتھ مجھے تشبیہہ نہیں دی"

"ہم اب بھی تمہارا مطلب نہیں سمجھے"

"سرکارِ عالی مدار! جس طرح مجرم نے دوسرے جانوروں کو انسان کے ساتھ تشبیہہ دی ہے' اگر اس طرح مجھے بھی کسی آدمی کے ساتھ تشبیہہ دیتا تو یقین کیجئے مجھے اس سے کوئی شکایت پیدا نہ ہوتی' لیکن افسوس کا مقام یہ کہ مجرم مسمّی مشکور نے مجھے تشبیہہ بھی دی ہے تو اپنی ذات کے ساتھ جو سارے انسانوں میں یقینی طور پر سب سے گھٹیا درجہ رکھتی ہے۔ ظلِ سبحانی! میں نے اس ظالم کا کیا بگاڑا تھا جو اس نے مجھ میں اور اپنی ذات میں کوئی مشابہت اور مماثلت محسوس کی۔ میں اس سے ہزار درجہ بہتر مقام رکھتا ہوں"۔ تمام دربار میں قہقہوں سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ میں ابھی فیصلے کا منتظر ہی تھا کہ صدیقی نے مجھے جگاتے ہوئے کہا "مشکور صاحب! میں کتنی دیر سے سیر کر کے واپس آ گیا ہوں۔ دوست محمد لالا بھی اپنا ناشتہ کر کے چلا گیا لیکن آپ ہیں کہ مُردے کی نیند سو رہے ہیں۔ اُٹھیے گھر چلتے ہیں۔ بھابی آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی"

آزادی کی تاریخ

"میرے دیس کے نالائق باشندو!"

"یہ ہمارے ساتھ زیادتی ہے"

"میرے نکمّے ہم وطنو!"

"یہ بھی زیادتی ہے"

"میرے ناخلف ساتھیو!"

"یہ بھی کچھ زیادہ مناسب نہیں"

"میرے نااہل دوستو!"

"بالکل غلط...... بالکل غلط"

"تو پھر اے سراپا گوش سامعین! آپ مجھے خود بتائیں کہ میں آپ کو کن القاب سے خطاب کروں؟"

"اے مہمانِ خصوصی! آپ جہاندیدہ مقرر ہیں۔ اپنے ذہن پر زور ڈال کر کوئی مناسب سا لقب ڈھونڈ نکالئے؟"

"کیا میں آپ کو سیدھے سادے انداز میں میرے پیارے ہم وطنو! کہہ کر خطاب نہیں کر سکتا"

"ہرگز نہیں...... ہرگز نہیں۔ یہ بہت فرسودہ لقب ہے۔ اگر تقریر مناسب اور نئے لقب کے ساتھ شروع کی جائے تو زیادہ اثر کرتی ہے اور چاقو کی طرح دل میں اتر جاتی ہے؟"

"مہمانِ خصوصی ایک لمحہ کے لئے سر کھجاتا ہے اور پھر یکایک اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے۔ وہ مجمع سے خطاب کرتا ہے "میرے بے وقوف ہم وطنو!"

"جزاک اللہ" ایک آواز

"ماشاء اللہ" دوسری آواز

"ایک لفظ میں پوری قوم کے کردار کی تصویر کھینچ کر رکھ دی" تیسری آواز

"اسے بلاغت کہتے ہیں" چوتھی آواز

"نعرۂ تکبیر" پانچویں آواز

"اللہ اکبر" سارا مجمع

"میرے بے وقوف ہم وطنو!" مہمانِ خصوصی پھر خطاب کرتا ہے۔ مجمع پھر داد دیتا ہے۔

"واہ واہ ...... سبحان اللہ۔ لفظ بیوقوف میں کس قدر صداقت اور خلوص ہے"

"آداب عرض کرتا ہوں۔ ...۔ آداب عرض کرتا ہوں"

"مہمانِ خصوصی"! ایک آواز

"زندہ باد" سارا مجمع

"مہمانِ خصوصی" وہی آواز

"فرخندہ باد!" سارا مجمع

"اے ہمارے مہمانِ خصوصی ہم تم پر قربان جائیں ایک بار ہمیں پھر اُسی طرح پکارو!"

"میرے بے وقوف ہم وطنو!" مہمانِ خصوصی نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ سامعین بے خود ہو کر پکار اُٹھے۔

"بے شک ...... بے شک ...... ہم بے وقوف ہیں۔ ہمیں آسانی سے بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں بے وقوف بنایا جاتا رہا ہے!"

"لیکن میرے بے وقوف دوستو! مجھے داد دیئے جا رہے ہو۔ میری تقریر تو سُن لو!"

"اب ہم آپ کی تقریر کیا سنیں گے۔ آپ نے تو ایک لفظ میں پوری تاریخ بیان کر ڈالی ہے۔ آپ کا یہ ایک لفظ قیامِ وطن سے آج تک کی مدت پر محیط ہے"!

"حضرات! خاموش ہو جائیے..... خاموش ہو جائیے۔ مہمانِ خصوصی کی تقریر سنیئے"..... کرسیٔ صدارت کے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کھڑے ہو کر تلقین کی۔

تمام مجمع پر خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ مہمانِ خصوصی گلا صاف کر کے تقریر شروع کرتا ہے۔

"میرے دوستو! ہمیں آزادی......"

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"حضرات میں کہہ رہا ہوں ہمیں آزادی......"

"آزادی کیا چیز ہوتی ہے؟"

"بھئی آپ لوگ کیوں مذاق کر رہے ہیں؟"

"ہمارے قابلِ صد احترام مہمانِ خصوصی! یقین کیجیے ہم مذاق نہیں کر رہے"

"تو پھر مجھے تقریر کیوں نہیں کرنے دیتے؟"

"آپ شوق سے تقریر فرمائیے ہم سراپا گوش ہیں"

"ہاں تو میں عرض کر رہا تھا ہمیں آزادی......"

"آپ نے پھر وہی لفظ استعمال کیا"

"آپ آزادی کا مطلب نہیں جانتے؟"

"جانتے تو آپ سے کیوں پوچھتے؟"

"کیا یہ لفظ آپ نے پہلے کبھی نہیں سنا؟"

"بہت سنا ہے بلکہ اتنی بار سنا ہے کہ اس لفظ کو سن سن کر کان پک گئے ہیں اسے استعمال تو ہر بڑا شخص کرتا ہے، اس کے معنی کوئی نہیں بتاتا۔ غالباً یہ کوئی بے معنی لفظ ہے؟"

"حاضرین! اس لفظ کے معنی تو بڑے وزن دار ہیں؟"

"کیا آزادی کسی جانور کا نام ہے"؟ ایک آواز

"غالباً ہاتھی یا گینڈے قسم کا جانور ہوگا" دوسری آواز

مہمانِ خصوصی ناراضی کے انداز میں بولنے لگے "بھئی آپ لوگ مجھ سے پھر مذاق کرنے لگے"۔

"اے معزز مہمانِ خصوصی! آپ ہم سے جو قسم چاہیں اٹھوا سکتے ہیں ہم آپ سے مذاق نہیں کر رہے ہیں۔ یقین کیجئے ہم نہایت سنجیدہ ہیں"

"تعجب ہے آپ کو آزادی کے معنی نہیں آتے"

"آپ ناراض نہ ہوں۔ ہم ذہن پر زور ڈال کر بتاتے ہیں...... سمجھ میں آ گیا...... سمجھ میں آ گیا...... آزادی نباتات سے تعلق رکھتی ہے...... غالباً کوئی عمدہ قسم کی گھاس ہے جسے چر کر گدھے موٹے ہو جاتے ہیں' اتنے موٹے کہ کبھی وہ کارخانہ دار بن جاتے ہیں اور کبھی بڑے بڑے عہدوں پر جا بیٹھتے ہیں یقیناً آزادی وہ صحت مند چارا ہے جو ہمارے ملک کے گدھوں کی مرغوب غذا ہے"۔

"بکواس بند کرو! میں تمہارا بہت لحاظ کر چکا۔ مجھے کمزور آدمی نہ سمجھنا۔ ایک اشارے میں تمہارا قلع قمع کرا سکتا ہوں"۔

"اے ہمارے عزت مآب مہمان! ہمیں معاف کر دیجئے ہم بھولے بھالے عوام ہیں۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں خلوصِ نیت سے کہہ رہے ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں آزادی نباتات میں سے نہیں ہے تو ہم اس پر اصرار نہیں کرتے۔ چلیے مان لیتے ہیں جمادات میں سے کوئی چیز ہوگی۔ غالباً آزادی ایک ایسا قیمتی چمکیلا پتھر ہے جس تک خاص لوگوں کی رسائی ہوتی ہے اور عام لوگ اس تک پہنچنا چاہتے ہیں تو اُن کے سر لہولہان ہو جاتے ہیں ——— اب ہماری سمجھ میں آیا عوام جو حال سے بے حال ہوئے ہیں وہ اسی پتھر کی وجہ سے ہوئے ہیں"

مہمانِ خصوصی نے جب دیکھا کہ جلسے میں موجود حاضرین بہت سادہ لوح واقع ہوئے ہیں تو اُسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اُس نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے جلسے سے پھر خطاب کرنا شروع کر دیا "محترم حاضرین! واقعی آپ لوگ بہت بھولے اور معصوم ہیں۔ ملائیے میں آج آپ کو آزادی کے بارے میں

کچھ باتوں سے آگاہ کر ہی دیتا ہوں۔ پہلی بات تو اچھی طرح یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ آزادی کسی قوم کے افراد کے لئے بہت ضروری چیز ہے۔"

"اے ہمارے کرم فرما مہمانِ خصوصی! کسی قوم کے افراد کے لئے تو بیت الخلا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔" جلسے میں سے کسی شخص نے ٹکڑا لگایا۔

مہمانِ خصوصی نے اُس شخص کی تائید کرتے ہوئے جواب دیا "ہاں.....ہاں.......آپ ٹھیک کہتے ہیں موجودہ زمانے میں قوم کے لئے خلا بھی ضروری ہے۔ انشاء اللہ وہ دن بھی آئے گا جب ہم لوگ خلا میں اپنے سیارے بھیج رہے ہوں گے۔" مجمع کے تمام لوگ حیرت سے کبھی مہمانِ خصوصی کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی اس شخص کی طرف۔ حیرت کا یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ مہمانِ خصوصی نے بلند آواز میں سمجھانے کے طور پر کہا "یاد رکھئے آزادی کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ جس میں سے اہم ترین یہ ہیں "تقریر کی آزادی" (مجمع بے اختیار ہنس پڑا) "تحریر کی آزادی" (مجمع پھر ہنسا) "عمل کی آزادی" (مجمع کی جانب سے قہقہہ بلند ہوا) "اظہارِ خیال کی آزادی" (مجمع ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوگیا) مہمانِ خصوصی کو پھر غصہ آیا۔ بڑے سخت لہجے میں کہا "آپ لوگ ہنس کیوں رہے ہیں؟"

"اے معزز مہمانِ خصوصی آپ باتیں ہی ایسی کر رہے ہیں۔"

"تقریر کی آزادی کا مطلب آپ نہیں جانتے؟" مہمانِ خصوصی نے پوچھا

"نہیں جانتے"۔ مجمع نے جواب دیا

"تحریر کی آزادی کا مطلب بھی معلوم نہیں؟"

"جی نہیں"

"اظہارِ خیال کے مفہوم سے بھی بے خبر ہو؟" اس سوال پر مجمع کے لوگ پھر بے اختیار ہو کر ہنس پڑے اور کہنے لگے "اے مہمانِ خصوصی اگر ہمیں مطلب اور معنی معلوم ہوتے تو پھر آپ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ بلکہ اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے آزادی کوئی گالی ہے، حرام زادی یا مال زادی قسم کی۔ اے ہمارے لیے اور قابلِ صد احترام مہمانِ خصوصی ہم آپ پر سو سو بار قربان جائیں اگر آپ ہمیں گالی ہی دینا چاہتے

ہیں تو سیدھی طرح گالی دیں اس میں تکلف کی کیا ضرورت ہے۔" مہمانِ خصوصی نے پھر غصہ سے جل کر کہا "آپ سمجھتے ہیں آزادی کی بات کر کے میں آپ کو گالی دے رہا ہوں؟"

"حضور آپ بُرا نہ مانیں ہمیں تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے"

"پھر تم واقعی بے وقوف ہو۔"

"کیا آپ نے ہمیں بے وقوف کہا ہے؟ سبحان اللہ۔ کیسا صحیح لفظ استعمال فرمایا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ زندہ و سلامت رکھے اور آپ تا ابد خوش و خرم رہیں۔ آمین ثم آمین۔۔۔۔۔ اے مہمانِ خصوصی! آپ ہمیں ایک بار پھر بے وقوف کہیں۔ آپ جوں ہی ہمیں بے وقوف کہتے ہیں ہم پر آزادی کا مفہوم واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہماری آزادی کا بے وقوف بننے اور بے وقوف بنانے سے بہت بڑا تعلق ہے۔"

مجمع سے ایک آواز بلند ہوتی ہے "مہمانِ خصوصی!" تمام مجمع جواب دیتا ہے "زندہ باد" یہ سُن کر مہمانِ خصوصی لاحول پڑھتا ہوا مجمع سے باہر نکل جاتا ہے۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا:

"مجھے معلوم نہ تھا یہ لوگ اس قدر بے وقوف ہیں۔۔۔ اس قدر بیوقوف۔۔۔۔ مجھے معلوم نہ تھا میں انہیں آزادی کی قسمیں بتا رہا تھا۔ تقریر کی آزادی، تحریر کی آزادی، اظہارِ خیال کی آزادی اور یہ لوگ اس طرح میرا منہ تک رہے تھے جیسے آزادی سے ان کا کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔ ناشکرے کہیں کے۔ بیوقوف۔ اچھا ہے اگر انہیں ابھی کچھ عرصے اور آزادی کی ہوا نہ لگنے دی جائے۔ جو قوم بار بار سمجھانے کے باوجود آزادی کا مفہوم سمجھنے سے گریز کرے اُس کا یہی علاج ہے۔"

شریف افسر

پچھلے ڈیڑھ دو سال سے ہمارے دفتر کا برا حال تھا۔ جو افسر بھی آتا، اُس سے ماتحت عملے میں کسی نہ کسی کی لڑائی رہتی۔ لڑائی سے میرا مطلب ناپسندیدگی ہے۔ ویسے افسر سے صحیح معنوں میں لڑنا تو ماتحت کے بس کی بات بھی نہیں۔ ماتحت کی لڑائی تو یہی ہے کہ وہ افسر کے پیٹھ پیچھے اُسے جی بھر کر گالیاں دے لے۔ ہاں تو بہت دنوں تک ہمارے دفتر میں یہی ہوتا رہا کہ جس افسر کو ہیڈ کلرک صاحب پسند کرتے، اُسے مولوی سلامت اللہ برا جانتے، جس افسر کو مولوی سلامت اللہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے، اُسے ہیڈ کلرک صاحب پسند نہ کرتے (مولوی سلامت اللہ اور ہیڈ کلرک ہمارے سارے دفتر کی پسند اور ناپسند کا معیار ہیں)۔

ایک دفعہ ایک افسر تبدیل ہو کر آئے، یہ بڑے ٹھاٹ سے رہتے تھے۔ نہایت ملنسار، ان کا دستر خوان بھی وسیع تھا۔ بقول ہیڈ کلرک صاحب انگریزی لکھتے اور بولتے بھی خوب تھے۔ آدمی صاف گو اور دلیر تھے۔ انہوں نے ہیڈ کلرک صاحب سے واضح الفاظ میں کہہ رکھا تھا۔

"میاں" جو کام چاہتے ہو وہ کرا لو، لیکن رقم پہلے سامنے رکھو۔ ادھر رقم رکھو گے، اُدھر کام ہو جائے گا۔"

ہیڈ کلرک صاحب کو اُن کی یہ صاف گوئی بہت پسند تھی، لیکن سلامت اللہ کو یہ صاحب ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ اُس کا کہنا تھا کہ صاحب حرام خور ہے، اسے خدا کا خوف

ہے نہ رسولؐ کا خیال۔ یہ اپنے ساتھ ہماری عاقبت بھی خراب کرنا چاہتا ہے۔

ان صاحب کا چھ ماہ بعد تبادلہ ہو گیا اور ایک چھوٹی عمر والے صاحب تشریف لائے یہ صاحب بڑے نیک اور دیانت دار آدمی تھے۔ مولوی سلامت اللہ کو ان کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی۔ ہیڈ کلرک صاحب بھی ان کی نیکی اور دیانت داری کی تعریف کرتے تھے لیکن اُن کا کہنا تھا کہ نیکی اور دیانت داری کو انسان اپنے تک محدود رکھے، یہ کہاں کی شرافت ہے کہ اس کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرے اور دوسروں کو بھی نیک اور دیانت دار بننے پر مجبور کرے اس کے علاوہ ہیڈ کلرک صاحب نے رازداری کے لہجے میں کئی بار یہ بھی کہا "ہمارے صاحب بہت ہی معمولی گھرانے کے چشم و چراغ معلوم ہوتے ہیں"۔

جب اُن سے یہ پوچھا گیا کہ آپ نے اندازہ کیسے لگایا، تو انہوں نے جواب دیا:

"اگر صاحب کسی بڑے خاندان کا آدمی ہوتا، تو وہ کبھی اس طرح باقاعدگی سے وقت پر دفتر نہ آتا۔ مجھے ملازمت کرتے عُمر گزر گئی ہے، میں نے آج تک کسی خاندانی افسر کو وقت پر دفتر آتے نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ ہمارا یہ صاحب ہر کاغذ کو بڑے غور سے پڑھتا ہے خاندانی لوگ اس طرح معمولی معمولی باتوں پر کبھی غور نہیں کیا کرتے"۔

چھ مہینے بعد یہ چھوٹی عمر والے صاحب بھی تبدیل ہو گئے۔ ان کی تبدیلی پر سارے دفتر نے خوشی کا اظہار کیا، البتہ مولوی سلامت اللہ بہت رنجیدہ تھے۔ ہیڈ کلرک صاحب اور دوسرے کلرکوں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا:

"مولوی! بہت زیادہ افسوس ہو رہا ہے تو صاحب سے گلے مل کر دل کا بوجھ ہلکا کر لے"۔

سلامت اللہ نے جھنجھلا کر جواب دیا:

"مجھے صاحب نے کون سی جاگیر بخش دی ہے۔ بس یوں ہی خیال آ رہا ہے کہ آدمی بُرا نہیں تھا"۔

اس چھوٹی عمر والے ناتجربہ کار صاحب کے بعد ایک اور صاحب آئے جنہیں دفتر

کا کوئی آدمی پسند نہ کرتا تھا، مگر اچھا ہوا کہ یہ صاحب جلد ہی تبدیل ہو کر چلے گئے۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب ہمارے دفتر کا ماحول بے حد خوشگوار ہے۔ موجودہ صاحب بہت ہی شریف آدمی ہیں۔ ان سے دفتر کا کوئی آدمی ناخوش نہیں، سب ان کی شرافت کی تعریف کرتے ہیں۔ خوش اخلاق اتنے ہیں کہ چپراسی تک سے آپ اور جناب میں بات کرتے ہیں۔ کوئی ماتحت دستخط کرانے کے لئے بھی آتا ہے، تو اس کے شکر گزار ہوتے ہیں، پھر لطف یہ ہے کہ اس کام کے لئے بھی زیادہ پریشان نہیں کرتے، پانچ سات کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد نگاہیں اٹھا کر شفقت سے فرماتے ہیں،

"معاف کرنا میاں تمہیں تکلیف ہو رہی ہوگی، میرا ہاتھ بھی دکھنے لگا ہے۔" فائلوں کی طرف اشارہ کر کے "اس خرافات کو سامنے سے اٹھاؤ، باقی کام کل سہی۔" ماتحتوں پر اس قدر اعتماد کرتے ہیں کہ فائل پر کوئی کچھ بھی لکھ کر لے آئے، یہ بغیر پڑھے دستخط کر دیں گے۔ سچ پوچھئے تو ایسے شریف النفس صاحب کو دھوکا دینے کے لئے کسی ماتحت کا دل بھی نہیں چاہتا۔ میں نے محض آزمانے کے طور پر کئی بار غلط احکام لکھ کر صاحب کے سامنے رکھ دیئے اور اس بندۂ خدا نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا کہ ان میں کیا لکھا ہے اور بے دریغ دستخط کر ڈالے۔ ایسے بلند حوصلہ صاحب کے لئے خواہ مخواہ دل سے دعا نکلتی ہے۔ ربّ العزت اسے ہمارے سر پر ہمیشہ قائم رکھے اور یہ رہتی دنیا تک شاد و آباد رہے۔ آمین۔

سچی بات یہ ہے کہ ہمارے صاحب کی شرافت کا کوئی مول نہیں۔ مثال کے طور پر چودھری صاحب ہمارے افسر نمبر ۲ ہیں۔ یہ اپنی قسم کے آپ ہیں۔ انہیں نہ کوئی دفتر میں پسند کرتا ہے اور نہ ہی پبلک ان سے خوش ہے۔ عام آدمی کا کام تو خیر یہ کیوں کرنے لگے، دفتر والوں کا کام بھی نہیں کرتے۔ چودھری صاحب سے جب کوئی ان کا بے تکلف دوست کہتا ہے کہ بھلے آدمی کچھ تو خدا کا خوف کیا کرو، تو وہ نہایت معقول جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں،

"بھائی میں ریٹائر ہونے والا ہوں۔ جوانی میں جو کمایا وہ اولاد کی خاطر تھا۔ اب

اپنا بھی تو کچھ خیال کرنا چاہیئے"۔

غرض بے چارے چودھری صاحب دولت سمیٹنے میں بری طرح مصروف ہیں۔ تمام علاقے میں کہرام مچا ہُوا ہے، لوگ اور اہل کار ہر روز صاحب کے پاس اُن کی شکایت لے کر آتے ہیں، لیکن واہ رے صاحب کی شرافت اور حوصلہ۔ وہ سب کی سنتے ہیں لیکن چودھری صاحب کو ایک حرف تک نہیں کہتے۔ آخر ایک دفعہ ایک منچلے نے صاحب سے پوچھ ہی لیا:

"جناب، آپ ہماری باتیں تو سُن لیتے ہیں، لیکن ان پر کوئی ایکشن نہیں لیتے"۔

صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

"بھائی، جس قدر میں چوہدری صاحب کو سمجھتا ہوں، آپ نہیں سمجھ سکے۔ وہ اپنی دانشمندی کی وجہ سے سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کام نہیں کرتا یا کاہلی دکھاتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے"۔

چوہدری صاحب کو جب معلوم ہُوا کہ صاحب اُن پر اس حد تک اعتماد کرتے ہیں، تو انہوں نے اپنی "کوششوں" میں مزید اضافہ کر دیا۔ بات تھا لگتی کہنی چاہیئے، لوگ چوہدری صاحب کو بُرا تو کہتے ہیں، لیکن ان میں ایک خوبی بلا کی ہے۔ وہ صاحب کے سامنے کبھی سر اُٹھا کر نہیں بولتے۔ لجاتے شرماتے کھڑے حضور حضور کرتے رہتے ہیں۔ صاحب اصرار کریں گے کہ میاں کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ یہ دھیمے سے کہیں گے کہ جناب اس خاکسار کو گناہ گار نہ فرمائیں۔ صاحب آخر گوشت پوست کے انسان ہیں اور فطرتاً شریف آدمی، انہیں چوہدری صاحب کی یہ ادا بالکل مسحور کر دیتی ہے۔

آپ جانتے ہیں اس زمانے میں شرافت عنقا ہے۔ اب کوئی افسر بھی ہے اور شریف بھی، تو پھر اس میں کسی دوسری QUALIFICATION کو تلاش کرنا ایک بے معنی سی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریف افسر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کام نہیں کرتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کام نہیں کر سکتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ افسری میں رہ کر کام کرنا خواہ مخواہ اپنے آپ کو خراب کرنے کے مترادف ہے۔ افسر کے کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں پر اعتماد نہیں رکھتا اور بے اعتمادی

شرافت کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ شریف آدمی افسر ہو کر دفتر کا کام بھی کرے، تو پھر جو لوازمۂ شرافت ہیں، اُنہیں کون سرانجام دے۔ مثلاً شرافت کے لئے اپنے مذاق کے مطابق لکھنا پڑھنا ضروری ہے، فنونِ لطیفہ سے شغف رکھنا لازم ہے، ثقافتی محفلوں میں شریک ہونا اہم ہے۔

ہمارے صاحب ہر سائل کی بات نہایت غور سے سنتے ہیں، البتہ سائل کی شکایات پر کبھی دھیان نہیں دیتے۔ اُن کا کہنا ہے کہ شکایت کرنا شرافت کے معیار سے گری ہوئی بات ہے، اسی طرح شکایت سُننا بھی بہت بڑی بداخلاقی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے چھوٹے صاحب اپنی "کوششوں" کے سلسلے میں گرفتار ہونے لگے تھے کہ ہمارے صاحب نے ڈٹ کر اُن کی مدد کی اور انہیں صاف بچا لیا۔ فرمانے لگے:

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ بہت رشوت کھاتا ہے، بدعنوانیاں کرتا ہے، لیکن آخر میرا ماتحت ہے۔ یہ میری شرافت سے بعید تھا کہ ماتحت پر کوئی مصیبت آتی اور میں خاموش کھڑا دیکھتا رہتا۔"

شریف افسر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ لالچی نہیں ہوتا۔ ہمارے صاحب کا بھی یہی حال ہے۔ اپنی ذات کے لئے کبھی کوئی فائدے کی بات نہیں کرتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اس میں انہوں نے نہایت منصفانہ درجہ بندی کی ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اوّل عزیز و اقربا، دوم احباب اور پھر کچھ بچ جائے تو حق حقدار کو پہنچنا چاہیئے، البتہ ان سب سے زیادہ اہمیت وہ ایک اور ہستی کو دیتے ہیں جسے عُرفِ عام میں محبوب یا محبوبہ کہا جاتا ہے۔ محبوب کے بارے میں بھی ان کا نظریہ نہایت وسیع ہے۔ وہ کہتے ہیں ہر صاحبِ حُسن ہمارا محبوب ہے۔ اگر وہ ایک پل کو قریب آ جائے، تب بھی اُس کا احسان ہے اور اگر یہ پل ایک صدی میں تبدیل ہو جائے، تب بھی اُس کی مہربانی۔ چنانچہ ہمارے صاحب کے سامنے جب کوئی محبوب اپنا کام لے کر آ جاتا ہے، پھر وہ تمام رشتوں کو منقطع کر دیتے ہیں۔ ہزار کسی سے کوئی وعدہ کیا ہو، اِن تمام عہد و پیمان کو نظرانداز کر کے محبوب کا کام تکمیل کو پہنچاتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ محبت کا رشتہ سب سے بالا رشتہ

ہے اور اسی رشتے سے انسانی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

ہمارے صاحب دفتر میں اگر کوئی کام کریں یا نہ کریں یا انہیں ملاقاتیوں کو چائے ہی پلانے کا کام کیوں نہ سرانجام کیوں نہ دینا پڑے، لیکن وہ ہمیشہ چاق و چوبند ہو کر تشریف لاتے ہیں۔ سنا ہے گھر پر رات کو غم غلط کرنے کے لئے ایک دو گھونٹ پی لیتے ہیں، لیکن اس سے ہمارا کیا تعلق، یہ ان کا پرائیویٹ معاملہ ہے، اس میں کسی کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ پہلے ہم اپنی نجی اور اجتماعی زندگی کو ایک سمجھتے رہے، لیکن انگریز نے یہ سبق خوب پڑھایا ہے کہ خلوت اور جلوت زندگی کے دو متضاد پہلو ہیں، انہیں غلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ ہم انگریز کے شکر گزار ہیں۔ بغور دیکھا جائے، تو ہمارے صاحب اور اُن کی شرافت بھی انگریز ہی کی مرہونِ منت ہے —— لیکن ہمیں ان جھگڑوں اور بحثوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے صاحب ہمارے لئے مجسمہ شرافت و رحمت ہیں، ایک بار پھر دعا کرتے ہیں کہ خدا انہیں ہمارے سر پر ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین۔

موصوف کی شرافت کی وجہ سے بہت سے عیب ڈھکے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے عیب چھپانا کوئی معمولی صفت ہے۔ یہ تو اللہ کی صفات میں سے ایک بڑی صفت ہے، اسی لئے صاحب عموماً کہا کرتے ہیں: میاں، اللہ ستار العیوب ہے۔ میں تمہارے عیب ڈھکتا ہوں، تم میرے عیب ڈھکو یہی شرافت ہے اور یہی انسانیت۔

مطبوعہ :- نواب سنز پبلشرز، ۶۴ ریواز گارڈن، لاہور